ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیرِ ادارت

امین احسن اصلاحی

دفتر رسالہ میثاق

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۳۶۰

ہندوستانی خریداروں کے لیے
ارسال زر کا پتہ
مینجر "الفرقان" کچہری روڈ لکھنؤ

☆

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۲ | بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۶۰ء مطابق شوال المعظم سنہ ۱۳۷۹ھ | عدد ۵

فہرست مضامین

تذکرہ و تبصرہ ——— امین احسن اصلاحی ۲

تدبر قرآن

تفسیر سورہ بقرہ ——— ،، ——— ۹

مطالعہ حدیث

معارف و مزامیر کا شرعی حکم ——— مولانا عبدالغفار حسن صاحب ——— ۱۸

تزکیہ نفس

تعلق باللہ کی اساسات ——— امین احسن اصلاحی ——— ۲۸

دعاء ——— مولانا عبدالغفار حسن صاحب ——— ۳۸

مراسلہ و مذاکرہ

دنیا میں ناقص چیزوں کے وجود کی مصلحت ——— شیعہ حضرات اور اکابر صحابہؓ

امام بخاریؒ کی مستند سوانح حیات ——— حضرت عائشہؓ سے کمسنی میں نکاح کی مصلحت ۴۴

آیات متشابہات

تقریظ و تنقید ۔ (تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی ۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں) ۵۳

محی الدین پرنٹر پبلشر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ میثاق لا۔ احمد سٹریٹ رحمانپورہ اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

اپریل کی ۱۶ کو جامعہ تعلیمات اسلامیہ کے ایک اجتماع کی شرکت کے لیے ہمیں لائل پور جانا پڑا۔ یہ ادارہ تین سال سے مولانا عبدالغفار حسن صاحب اور مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف کی زیر نگرانی کام کر رہا ہے اور اس کا خاص مقصد وقت کے نئے تقاضوں کے مطابق تعلیم یافتہ نوجوانوں میں عربی زبان اور دین کی تعلیم کو پھیلانا ہے۔ اگرچہ ان تین سالوں میں اس ادارے کو سازگار حالات بہت کم میسر آسکے تاہم اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ اس کے کام میں وسعت و ترقی ہوئی ہے۔ اور اس سے فائدہ اٹھانے والوں اور اس کی مدد کرنے والوں کی تعداد میں آہستہ آہستہ اضافہ ہو رہا ہے۔ توقع ہے کہ بہت جلد یہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جائے گا۔ اور اس کے ذریعہ سے علم دین اور عربی زبان کی بیش بہا خدمات انجام پائیں گی۔

جس اجتماع کا ذکر ہے یہ جامعہ کے نئے تعلیمی سال کا افتتاحی اجتماع تھا۔ اس میں ناظم ادارہ مولانا عبدالغفار حسن صاحب نے جامعہ کے کاموں کی رپورٹ پیش کی۔ مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے آگے کے منصوبوں اور عزائم کا ذکر کیا۔ تین چار طلبہ نے، جو جامعہ میں زیر تربیت ہیں، عربی میں تقریریں کیں۔ عراق کے ایک فاضل نوجوان، صالح مہدی سامرائی صاحب نے عربی زبان سیکھنے کی ضرورت و اہمیت پر ایک پرجوش تقریر کی۔ شہر کے معززین اور ارباب خیر کی ایک اچھی تعداد نے اس اجتماع میں شرکت کی اور ادارہ کے کاموں سے دلچسپی لی۔ ان ساری چیزوں کو دیکھ کر ہمیں

اندازہ ہوا کہ حالات خواہ کتنے ہی ناسازگار ہوں لیکن اللہ کے کچھ مخلص بندے اگر مضبوط ارادے کے ساتھ ایک اچھے مقصد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو اللہ تعالیٰ ان کی تائید و رفاقت کے لیے بہت سے لوگوں کو کھڑا کر دیتا ہے۔

اس اجتماع میں راقم نے بھی تعلیم دین اور اس کی اہمیت پر ایک مختصر سی تقریر کی جس کے بعض نکات مختصر طور پر یہاں بھی ہم پیش کیے دیتے ہیں تاکہ 'میثاق' کے قارئین بھی ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔

ہم نے اس کی اہمیت کا ایک پہلو یہ واضح کیا کہ ہم مسلمان نسل و نسب، ملک و وطن یا خون اور رنگ سے بنی ہوئی کوئی قوم نہیں ہیں۔ ہم اس طرح وجود میں نہیں آئے ہیں جس طرح کیکر کے درخت سے دوسرا کیکر یا آم کے درخت سے دوسرا آم کا درخت پیدا ہو جاتا ہے بلکہ ہم اصولوں اور عقائد، نظریات اور مقاصد سے بنی ہوئی ایک ملت ہیں جس وجود مقدس نے ہمیں مسلم کا لقب بخشا ہے خود اس کی تاریخ حیات کا سب سے زیادہ اہم واقعہ یہ ہے کہ وہ آزر کے گھر میں ابراہیمؑ بن کر آیا تھا۔ اس نے باپ کی روایات سے تشخص حاصل کرنے کے بجائے خدا کی ہدایات سے اپنے آپ کو سنوارا اور یہی ہدایات اس کی زندگی کے لیے رہنما اصول بنیں۔ انہی اصولوں کو اگر ہم جانیں اور مانیں تو ہم مسلم باقی رہتے ہیں اور اگر ان اصولوں سے بے خبر اور ناآشنا ہو جائیں تو نسل و نسب اور ملک و وطن کی کوئی اونچی سے اونچی نسبت بھی ہمیں اسلام کے ساتھ وابستہ نہیں رکھ سکتی۔ اس بنیادی حقیقت کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ دوسری تمام چیزوں کا علم، خواہ وہ کتنی ہی ضروری چیزیں ہوں، اہمیت کے لحاظ سے ہمارے لیے دین کے علم کے مقابل میں ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ سب سے مقدم علم ہمارے لیے دین کا علم ہے۔

دوسری حقیقت ہم نے یہ واضح کی کہ ہم دنیا میں رہنے بسنے والی قوموں میں سے صرف ایک قوم ہی نہیں ہیں بلکہ خدا نے ہمیں شہداء اللہ فی الارض کی حیثیت سے مبعوث کیا ہے۔ ہمارے اوپر خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کے لیے اس دنیا کی ہدایت و رہنمائی کی ذمہ داری ڈالی ہے۔ اس ذمہ داری کی اگر ہمارے نزدیک کوئی اہمیت ہے اور ہم اس کا کچھ بھی

احساس رکھتے ہیں تو دوسری تمام چیزوں سے پہلے اس بات کا اہتمام ہونا چاہیے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ ہم جس خدائی پیغام کے اس دنیا میں پیغامبر ہو کر آئے ہیں وہ پیغام کیا ہے اور اس پیغام کے کیا تقاضے ہیں جو صرف ہم ہی کو نہیں بلکہ ہماری آئندہ نسلوں کو بھی پورے کرنے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لیے سب سے مقدم چیز ہمارے لیے دین کی تعلیم ہے۔ اگر ہم دنیا جہاں کے تمام علوم سیکھ ڈالیں لیکن ہم دین ہی سے محروم رہیں تو اپنے مقصد وجود کے لحاظ سے ہماری یہ ساری تعلیمی سرگرمیاں بالکل بے معنی ہوں گی۔

تیسری حقیقت ہم نے یہ واضح کی کہ علم دین کی اس اہمیت کے باوجود ہمارے موجودہ نظام تعلیم کا حال یہ ہے کہ اس کے متعلق بلا مبالغہ اور بلا تکلف یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس میں سب کچھ ہے لیکن دین ــــ دین کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ نظام تعلیم ہمیں انگریزوں سے وراثت میں ملا تھا جنھوں نے اپنے مخصوص سامراجی مقاصد کے تحت اس کو اس ملک میں جاری کیا تھا۔ ملک کے آزاد ہو جانے کے بعد ہمارا پہلا فرض یہ تھا کہ ہم اپنے اس ملی نصب العین کو سامنے رکھ کر اس میں تبدیلیاں کر لیتے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اوّل تو اس میں کوئی تبدیلی اب تک ہوئی نہیں اور اگر ہوئی بھی تو وہ نقطہ نظر سے وہ پہلے سے بھی زیادہ مایوس کن ہے اور آئندہ بھی اس میں کسی اچھی تبدیلی کے آثار نظر نہیں آ رہے ہیں۔ ایسے حالات میں ان تمام لوگوں کا، جو اپنے ملی نصب العین سے دستبردار ہو جانے کے لیے تیار نہیں ہیں یہ فرض ہے کہ دین کے سیکھنے اور سکھانے کے لیے جو کچھ وہ بطور خود کر سکتے ہیں اس سے دریغ نہ کریں، ورنہ زیادہ زمانہ نہیں گذرے گا کہ وہ بحیثیت مسلم کے اپنے سارے امتیازات کھو بیٹھیں گے۔

اس سلسلے میں چوتھی حقیقت ہم نے یہ واضح کی کہ ادھر ایک عرصہ دراز سے دین کے سیکھنے سکھانے کی تھوڑی بہت جو خدمت بھی انجام پا رہی ہے وہ صرف ان عربی مدارس کے ہاتھوں انجام پا رہی ہے جو دین دار مسلمانوں کے عطیات اور صدقات و زکوٰۃ کی رقموں سے چل رہے ہیں۔ ہر قسم کے نامساعد بلکہ مخالف حالات کے اندر ان مدرسوں کے ایثار پیشہ بانیوں اور کارکنوں نے ان کو باقی رکھا ہے۔

اگر خدانخواستہ یہ مدارس نہ ہوتے تو ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی تکلف نہیں ہے کہ اس ملک سے دین کی تعلیم کا نام بھی مٹ گیا ہوتا۔ لیکن ان مدارس کی خدمات کے اعتراف کے باوجود، ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان کے فکر اور ان کے نظام تعلیم میں بعض ایسی کمیاں اور خرابیاں ہیں جن کے سبب سے موجودہ حالات میں یہ تعلیم دین کی کوئی موثر خدمت انجام نہیں دے سکتے۔ ہم ان خرابیوں میں سے بعض کی طرف یہاں اشارہ کیے دیتے ہیں۔

ان مدارس میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ان میں دین کی تعلیم فرقہ وارانہ عصبیت اور تقلید کے نظریہ کے تحت دی جاتی ہے۔ یہ چیز بنیادی طور پر غلط ہے۔ اس غلطی سے تعلیم دین کے نصب العین کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ ماضی میں اگر یہ نقصان زیادہ نہیں محسوس کیا گیا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ بعض حالات میں بعض چیزوں کا نقصان زیادہ ظاہر نہیں ہوا کرتا لیکن اس زمانہ میں اس چیز کو باقی رکھنا ہمارے نزدیک تعلیم دین کو ختم کر دینے کے ہم معنی ہے۔

ان میں دوسری خرابی یہ ہے کہ ان مدارس میں تعلیم پانے والوں کو موجودہ فکر و فلسفہ سے واقف کرنے اور اسلام کی روشنی میں اس پر تنقید کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہے اس وجہ سے ان کے فارغین موجودہ زمانہ میں اسلام کو پیش کرنے کے لیے اپنے اندر کچھ زیادہ موزونیت نہیں رکھتے۔

تیسری خرابی ان میں یہ ہے کہ بظاہر تو یہ مدرسے عربی زبان اور دین کی تعلیم ہی کے لیے قائم کیے گئے ہیں لیکن بعض وجوہ سے، جن کی تفصیل کے لیے یہ موقع موزوں نہیں ہے، ان میں عربی زبان اور صحیح دین کی تعلیم پر بہت کم توجہ صرف کی جاتی ہے، زیادہ توجہ ایسی چیزوں پر صرف کی جاتی ہے جن کا دین سے یا تو کوئی تعلق سرے سے ہے ہی نہیں یا ہے تو محض برائے نام۔

چوتھی خرابی ان میں یہ ہے کہ ان مدارس میں طلبہ کے سامنے دین اور علم دین کی خدمت کا کوئی بلند نصب العین نہیں رکھا جاتا۔ بس بڑا سے بڑا کوئی مقصد اگر ان کے فارغین کے سامنے ہوتا ہے تو یہ کہ کسی مسجد میں امامت کریں یا کسی درسگاہ میں مدرسی۔ ظاہر ہے کہ اس عزم و حوصلہ کے لوگ ان کاموں کے لیے بالکل ناموزوں ہیں جو اسلام کی خدمت کے لیے آج مطلوب ہیں۔

اس کے بعد ہم نے اس سلسلہ کی جس آخری اور سب سے اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے وہ یہ ہے

کہ اہل مغرب کے غلبہ کے بعد سے ہم جس جدید فکری تصادم سے دوچار ہوئے تھے اب اس تصادم نے آخری مرحلہ میں قدم رکھ دیا ہے۔ سائنس کی حیرت انگیز ترقیوں نے فلسفہ اور مذہب ہر چیز کو چیلنج کر دیا ہے اور انسانیت کا تمام اخلاقی، روحانی اور مذہبی سرمایہ اس وقت مادیت کے شیطان کے براہ راست حملوں کی زد پر ہے۔ اس وقت اگر ہم نے اپنے آپ کو اس حملہ کے مقابلہ کرنے کا اہل ثابت نہ کیا اور اسلام کی حقیقی روحانیت و عقلیت سے مسلح ہو کر مادیت کے عفریت کے پنجہ کو توڑ نہ دیا تو اندیشہ ہے کہ باطل کے علمبرداروں کے حوصلے اس قدر بڑھ جائیں گے کہ لوگوں کے لیے ان کے آگے اسلام اور قرآن کا نام بھی لینا مشکل ہو جائے گا۔

ان باتوں کی طرف حاضرین کو توجہ دلانے کے بعد ہم نے ان سے تعلیمات اسلامیہ جیسے اداروں کی سرپرستی اور خدمت کی اپیل کی۔ ہمارے نزدیک اس وقت اسلام کے تحفظ اور اس کی مدافعت کے لیے جو کام کیے جا سکتے ہیں ان میں ایک اہم ترین کام مختلف مقامات پر اس قسم کے تعلیمی و تربیتی اداروں کا قیام ہے۔ جو ادارے اس نصب العین کے تحت قائم ہوں گے انشاء اللہ وہ آپ سے آپ ایک رشتہ تنظیم میں منسلک ہوتے جائیں گے۔ پھر ایک مرکزی تنظیم وجود میں آ کر ان سب کو اپنی نگرانی و رہنمائی میں لے لے گی۔ ان اداروں کا اصلی پیغام یہ ہو گا کہ "دین سیکھو اور سکھاؤ"۔ اس دعوت کو عام کرنے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جتنے راستے بھی موجودہ حالات میں یہ اختیار کر سکتے ہیں، ان کو اختیار کریں گے اور جتنی صلاحیتیں اور قابلیتیں بھی ان کو حاصل ہو سکیں گی ان سب کو ایک نصب العین پر جمع کرنے کی یہ کوشش کریں گے۔ انشاء اللہ اسلام کی خدمت کے اس میدان میں جدید علوم کے فاضلین اور علم دین کے کاملین دونوں دوش بدوش نظر آئیں گے۔

جن لوگوں کو سیاسی ہنگامہ آرائیوں کا چسکا پڑ جایا کرتا ہے انھیں اس طرح کی خاموش خدمتیں اپیل نہیں کرتیں۔ انھیں وہی پلیٹ فارم پسند آتے ہیں جہاں انھیں دھونس جمانے اور ہیکڑی جتانے کے مواقع ملیں۔ اگر یہ چیز انھیں حاصل نہیں ہوتی تو وہ خمار زدہ افیونی کی طرح بالکل ٹھنڈی لاش بن کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ انبیاء علیہم السلام کے طریقہ پر خلق خدا کی خدمت کرنا چاہتے ہیں وہ دھونس اور ہیکڑی

کے بجائے، عزیمت، محبت، اعتماد، استقامت اور دل جوئی کی راہیں اختیار کرتے ہیں اور خدا اور آخرت کے سوا لوگوں کو کسی دوسری چیز سے کبھی نہیں ڈراتے۔ وہ کبھی کسی کے حریف کی حیثیت سے نمایاں نہیں ہوتے بلکہ ہر ایک کے مخلص و محب کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور اللہ کے دین اور لوگوں کی خیر خواہی کے لیے سب سے بے نیاز لیکن سب کے خادم بن کر کام کرتے ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کے لیے خدمت کی راہ کبھی بند نہیں ہے وہ چیونٹی اور شہد کی مکھی کی طرح ہمیشہ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔

(۲)

مئی میں میثاق نے اپنی زندگی کا ایک سال پورا کر لیا۔ اس قلیل مدت میں اگر اس سے اسلام اور مسلمانوں کی کوئی حقیر خدمت بن آئی ہے تو یہ محض اس رب کریم و کارساز کا فضل و احسان ہے جس نے اس کام کی توفیق دی اور اس کے لیے اسباب و رسایل فراہم کیے۔

اس موقع پر میں ان دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس خدمت میں میرا ہاتھ بٹایا ہے۔ درحقیقت انہی کے تعاون سے یہ رسالہ جاری ہوا اور پھر انہی کے تعاون سے یہ جاری رہ سکا ہے۔ میرا حصہ تو اس خدمت میں صرف اس قدر ہے کہ صحت کی کمزوری کے باوجود سال بھر میں نے اس کے صفحات اپنے خونِ جگر سے رنگین کیے اور اس روحانی لذت کے سوا جو اس خدمت میں مجھے حاصل رہی ہے اور کوئی منفعت اس سے حاصل کرنے کی میں نے طمع نہیں کی۔

اس وقت رسالے کی اشاعت کی جو رفتار ہے اس سے توقع ہے کہ آنے والے سال میں انشاء اللہ یہ پورے طور پر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا، بشرطیکہ اس کے ہمدردوں کی دلچسپی اس کے ساتھ قائم رہے اور توسیع اشاعت کے لیے کچھ نہ کچھ حرکت ہوتی رہے۔

جن خریداروں کی مدت خریداری مئی میں ختم ہو رہی ہے اگر وہ اپنے چندے منی آرڈر کے ذریعہ سے بھیج دیں تو یہ دفتر پر، میثاق پر اور خود میرے اوپر ایک بہت بڑا احسان ہوگا۔ دفتر میں کام کرنے والے رفیق ابھی اس کام میں ناتجربہ کار ہیں۔ اگر ان سارے خریداروں کو وی پی ہی بھیجنا پڑے جن کو اگلے ماہ میں وی پی جانے ہیں تو اس سے مالی نقصان کے علاوہ دفتر کی الجھنوں میں بڑا اضافہ ہو جائے گا۔

ہندوستان کے خریداروں میں سے جن کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے وہ اپنے چندے براہ کرم الفرقان لکھنؤ یا دائرہ حمیدیہ کو بھیج دیں اور اپنی رسیدیں دفتر میثاق کو۔

یہ اعلان ان حضرات سے متعلق نہیں ہے جن کو پرچہ ہدیتہ یا اعزازی طور پر بھیجا جا رہا ہے۔ ایسے حضرات سے صرف یہ گذارش ہے کہ وہ اس امر سے دفتر کو آگاہ کر دیں کہ پرچہ باقاعدگی سے انھیں پہنچ رہا ہے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم تو باقاعدگی کے ساتھ انھیں پرچہ بھیج رہے ہوں لیکن انھیں پرچہ کسی وجہ سے موصول نہ ہو رہا ہو۔ سال میں ایک مرتبہ اس چیز کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

پرانے خریداروں میں سے جو حضرات اپنے چندے منی آرڈر سے بھیجیں وہ براہ کرم کوپن پر اپنے نمبر خریداری کی تصریح ضرور کر دیں۔ ورنہ اس سے سخت گڑبڑی پیدا ہو گی۔

(۳)

"تفسیر آیۃ بسم اللہ و تفسیر سورہ فاتحہ کے قدردانوں سے میں سخت شرمندہ ہوں کہ اس کی طباعت کے بارے میں میرے سارے اندازے غلط نکلے۔ پہلے اس کے سرورق کے کاغذ کی مشکل پیش آئی جب یہ مشکل کسی طرح حل ہوتی نظر آئی تو کتاب کے پروف انزوالیے گئے لیکن پروف انزوا چکنے کے بعد اصل کتاب کی طباعت کا سوال جب سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ بازار میں کرنافلی کاغذ ایک شیٹ بھی نہیں مل رہا ہے۔ یہ چند ریم کاغذ تلاش کرنے کے لیے برادرم محی الدین صاحب نے بڑی دوڑ دھوپ کی، لیکن لاہور جیسا شہر ان کی یہ ذرا سی ضرورت پوری کرنے میں ناکام رہا۔ اب پروف میرے میز پر پڑے ہوئے ہیں اور کاغذ کے متعلق ارباب کاغذ اس کے سوا کچھ نہیں بتاتے کہ "عنقریب" آ رہا ہے۔ اب دیکھیے "عنقریب" کا یہ وعدہ کب پورا ہوتا ہے۔ اور موجودہ لغت میں عنقریب کی اس اصطلاح کا کیا مفہوم ہے۔

کہتے ہیں کہ آدمی کے عارف اور اولیاء اللہ بن جانے کے لیے یہی ضروری نہیں ہے کہ اس کے سامنے خدا کی خدائی کی کوئی بہت بڑی نشانی ہی ظاہر ہو۔ صلاحیت ہو تو کوئی چھوٹا سا واقعہ بھی اس کے دل کے تمام پردے اٹھا دینے کے لیے بالکل کافی ہوتا ہے۔ میں جب ایک چھوٹے سے کام میں اپنے ارادے کی ناکامیوں کا یہ حال دیکھتا ہوں تو مجھ پر یہ حقیقت تو اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ٹھیک کہا ہے جس نے کہا ہے کہ عرفت ربی بفسخ العزائم لیکن معرفت اور ولایت کا مقام تو خدا کی دین ہے وہ جس کو چاہے دے۔

قدردانوں کی عجلت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ اگر کرنافلی سفید کاغذ نہیں دستیاب ہو رہا ہے تو کتاب اخباری کاغذ ہی پر چھاپ دی جائے لیکن اپنی طبیعت اس بات پر راضی نہیں ہوئی۔ دیکھیے شاید چند دنوں میں کاغذ ملنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ (باقی صفحہ ۵۶ پر)

تدبّرِ قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورہ بقرہ

(۱۰)

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ | سجدہ کا لفظ عربی زبان میں جھکنے کے معنی میں آتا ہے۔ جھکنے کے مختلف مدارج ہو سکتے ہیں۔ کسی کے آگے تعظیم کے طور پر سر نہوڑا دینا بھی جھکنا ہے اور پیشانی اور ناک کو زمین پر رکھ دینا بھی جھکنا ہے۔ پچھلے مذاہب میں تعظیم کی یہ قسم غیر اللہ کے لیے جائز تھی لیکن عموماً اس کی حد وہی تھی جو ہمارے ہاں رکوع کی ہے۔ بنی اسرائیل میں اس طرح کے تعظیمی سجدے کا عام رواج تھا اور تورات کے مختلف مقامات سے اس کی جو شکل معین ہوتی ہے وہ رکوع سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ اسلام نے تعظیم کی اس شکل کو خدائے رب العزت کے لیے خاص کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام خدا کا آخری اور کامل دین ہے، اس نے توحید کی حقیقت کو مکمل طور پر اجاگر کر دینے کے لیے خدا کے لیے تعظیم و تذلل کی شکلیں بھی خاص کر دی ہیں تاکہ اس کے اندر شرک کے داخل ہونے کے لیے کوئی رخنہ باقی نہ رہ جائے۔

فرشتوں کو آدم کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دینے میں شرک کا کوئی پہلو نہیں ہے اس لیے کہ اولاً تو یہ سجدہ خدا کے حکم کی تعمیل میں تھا اس لیے گویا خدا ہی کو سجدہ تھا، ثانیاً سجدہ شرک کی علامت، جیسا کہ عرض کیا گیا، اسلام میں قرار دیا گیا ہے۔ اسلام سے پہلے اس کی اہمیت تعظیم کے ایک طریقہ سے زیادہ کچھ بھی نہیں تھی۔ اگر یہ کہا گیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آدم کو تعظیم بجا لاؤ، اس سے زیادہ

اس کا مفہوم نہیں ہے۔

فرشتوں کو آدم کی تعظیم بجالانے کا حکم کیوں دیا گیا؟ ہمارے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کی اطاعت اور بندگی کا ایک امتحان تھا۔ کسی کا امتحان اسی چیز میں لیا جاتا ہے جو اس کے نفس پر شاق ہو سکے۔ فرشتوں کی خلقت چونکہ نور سے ہوئی ہے اور وہ خدا کی تسبیح و تقدیس کے لیے پیدا ہوئے ہیں اس وجہ سے آدم خاکی کی تعظیم بجالانے کے حکم میں ان کے لیے ایک بڑی آزمائش تھی لیکن فرشتے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اصلی عزت و سرفرازی نور یا نار سے پیدا ہونے میں نہیں ہے بلکہ پیدا کرنے والے کے احکام کی بے چون و چرا تعمیل میں ہے۔ چنانچہ وہ اس امتحان میں پورے اترے۔

اس میں شبہ نہیں کہ فرشتوں کے اس سجدے سے آدم کی بڑائی کا ایک پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے لیکن یہاں مقصود آدم کی بڑائی کا اظہار نہیں بلکہ فرشتوں کی بندگی و اطاعت کا اظہار ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ جو خدا کے مطیع و فرمانبردار ہوتے ہیں وہ نسل و نسب کے غرور میں مبتلا ہو کر ابلیس کی طرح اکڑا نہیں کرتے، بلکہ وہ اس طرح کی ہر چیز کو خدا کا فضل و احسان سمجھتے ہیں اور اس فضل و احسان کا احساس ان کے اندر غرور و تکبر کے بجائے تواضع اور بندگی پیدا کرتا ہے۔

موقع کلام کے لحاظ سے یہ بات ان بنی اسرائیل کے لیے ایک سبق ہے جو نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں فرشتوں کی سی روش اختیار کرنے کے بجائے شیطان کی پیروی میں غرور نسل و نسب کے فتنے میں مبتلا ہو گئے تھے۔

جو لوگ فرشتوں کی طرف سے آدم کی اس تعظیم کو آدم کی علمی فضیلت کا نتیجہ سمجھتے ہیں میرے نزدیک ان کے اس خیال کے لیے کوئی مضبوط بنیاد نہیں ہے۔ اپنی ذریت کے اسماء کا علم جس طرح خدا کے بتانے سے آدم کو حاصل ہو گیا اسی طرح آدم کے بتانے سے فرشتوں کو حاصل ہو گیا، پھر اس میں آدمؑ کی ایسی فضیلت کا کیا پہلو ہے جس کی بنا پر فرشتوں کو ان کے سجدہ کا حکم دیا جائے۔ علاوہ ازیں اس بات کا بھی کوئی قوی ثبوت موجود نہیں ہے کہ فرشتوں کو آدم کی اس تعظیم کا حکم اسی وقت دیا گیا جب آدمؑ نے ان کو ناموں سے آگاہ کیا ہے۔ بلاشبہ سجدہ کے حکم کا ذکر یہاں تعلیم اسماء کے ذکر کے بعد ہی آیا ہے۔ لیکن محض اتنی سی بات اس امر کے ثبوت کے لیے کافی نہیں ہے کہ پہلی چیز اسی دوسری چیز کا نتیجہ ہے۔ اول تو سجدے کے حکم کا بیان لفظ اذ سے شروع ہوتا ہے جو اس بات کے لیے

ایک قوی قرینہ فراہم کرتا ہے کہ یہ ایک مستقل بات ہو، ضروری نہیں کہ یہ پہلی بات کے بعد ہی پیش آئی ہو۔ ثانیاً قرآن مجید کے دوسرے مواقع سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو آدم کے سجدے کا حکم نہ صرف آدم کی علمی فضیلت کے اظہار سے پہلے بلکہ ان کی پیدائش سے بھی پہلے دیا گیا تھا۔ مثلاً فرمایا ہے:-

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ

(۲۸ - حجر)

اور یاد کرو جب کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں تو جب میں اس کو مکمل کر لوں اور اس میں اپنی روح میں سے روح پھونک لوں تو تم اس کے لیے سجدہ میں گر جانا تو سارے فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے اس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل ہونے سے انکار کیا۔

اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں اور بھی ہیں جن سے واضح ہے کہ فرشتوں کو آدم کے سجدے کا حکم آدم کی پیدائش سے پہلے دیا گیا تھا اور ان آیات سے ضمناً یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اصل مقصود اس سجدے سے فرشتوں کی اطاعت اور وفاداری کا امتحان ہی تھا، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یہاں آدمؑ کے سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیے جانے کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا گیا ہے تاکہ اس امتحان میں فرشتوں کے لیے آزمائش کا جو پہلو ہے، وہ ان کے سامنے واضح ہو کر آجائے۔ ہم اوپر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ امتحان ہمیشہ اس چیز میں ہوا کرتا ہے جو نفس پر شاق ہو۔ فرشتوں کے لیے یہ بات بڑی ہی آزمائش کی تھی کہ وہ نور کی مخلوق ہونے کے باوجود آدم خاکی کو، جو سڑی ہوئی کیچڑ سے وجود میں آیا ہے، سجدہ کریں لیکن وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ عزت و شرف بخشنے والی چیز درحقیقت خدا کی فرمانبرداری ہے نہ کہ نور یا نار سے پیدا ہونا، اس وجہ سے اس امتحان کے سخت ہونے کے باوجود وہ اس میں پورے اترے لیکن ابلیس اپنے غرور کے سبب سے اس امتحان میں ناکام ہو گیا۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ بعض آیات میں سجدے کا ذکر آدم کی پیدائش اور ان کی صورت گری کے ذکر کے بعد آیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض آیات میں ترتیب مضمون اس طرح بھی ہے

لیکن اس طرح کے مواقع پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مقصود انسان پر اپنی نعمتوں کا بیان ہے نہ کہ یہ واضح کرنا کہ فلاں واقعہ فلاں واقعہ کے بعد پیش آیا ہے۔

الا ابلیس ابلیس، ابلَسَ سے افعیل کے وزن پر ہے۔ ابلس کے معنی غمگین ہونے، انکار کرنے اور مایوس ہونے کے ہیں۔ ابلیس دراصل اس جنی کا لقب ہے جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ قرآن مجید میں اس بات کی تصریح ہے کہ یہ جنات میں سے تھا۔ سورہ طٰہٰ میں ہے وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (اور یاد کرو، جب کہ ہم نے کہا فرشتوں سے کہ سجدہ کرو آدم کو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے، وہ جنات میں سے تھا اس نے اپنے رب کے حکم سے انحراف کیا۔)

قرآن مجید نے مکلف مخلوقات کی حیثیت سے تین مخلوقات کا ذکر کیا ہے۔ فرشتے، جنات اور بنی آدم۔ شیطان کوئی مستقل مخلوق نہیں ہے۔ جنوں اور انسانوں میں سے جو لوگ خدا کی نافرمانی کی روش اختیار کر لیتے ہیں وہ لوگ ابلیس کی ذریت اور اس کے اولیاء میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے جنات اور انسان گمراہی پر پیدا نہیں کیے گئے، پیدا تو یہ ہوئے ہیں اسی فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے تمام جنوں اور تمام انسانوں کو پیدا فرمایا ہے لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو اختیار کی نعمت سے نوازا ہے، اس وجہ سے ان میں سے جو لوگ اپنے لیے گمراہی کے راستے ہی کو پسند کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اسی راستے پر چلنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کی قرآن مجید میں جگہ جگہ تفصیل فرمائی ہے۔ ہم اس کے مختلف پہلوؤں کی مناسب مواقع پر وضاحت کریں گے۔

یہاں ایک بات بعض لوگوں کو کھٹکے گی۔ وہ یہ کہ سجدے کا حکم تو فرشتوں کو دیا گیا تھا نہ کہ جنات کو تو ابلیس کو جو جنات میں سے تھا سجدہ نہ کرنے پر لعنت کا مستحق کیوں قرار دیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جنات اور فرشتوں میں اصلی فرق خصائص اور صفات کے پہلو سے ہے، اپنی خلقت کے لحاظ سے جنات فرشتوں سے زیادہ دوری نہیں رکھتے، فرشتے نور سے پیدا ہوئے ہیں اور جنات نار سے۔ اس وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علی سبیل التغلیب جنات بھی اس حکم سجدہ میں شامل تھے، لیکن ان کے گمراہ فرد ابلیس نے سجدہ سے انکار کیا۔ یہ رائے ہمارے بعض پچھلے مفسرین نے بھی ظاہر فرمائی ہے اور مجھے یہ رائے قوی معلوم ہوتی ہے[1]

---

[1] قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ملاحظہ ہوں :- (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

ولا تقربا ھذہ الشجرۃ | شجرہ پر الف لام داخل ہے جس سے یہ بات تو واضح ہے کہ جہاں تک آدمؑ اور حوا علیہما السلام کا تعلق ہے، ان کو یہ درخت تعین اور تخصیص کے ساتھ بتا دیا گیا تھا۔ رہا یہ سوال کہ یہ درخت کس چیز کا تھا؟ تو اس سوال کا جواب نہ تو قرآن مجید ہی نے دیا ہے اور نہ کسی صحیح حدیث ہی میں اس کا جواب موجود ہے اس وجہ سے اس کو معلوم کرنے کی کوشش ایک لاحاصل کوشش ہے۔ ہمارے نزدیک اس بارے میں صحیح مسلک امام ابن جریرؒ کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "ہم تعین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ درخت کس چیز کا تھا، کیونکہ اس کے تعین کے لیے کوئی دلیل نہ تو ہمیں قرآن ہی میں ملتی ہے نہ حدیث ہی میں، پھر آخر کوئی شخص کوئی بات کہے تو کس سند پر"۔

ہمارے نزدیک اس درخت کو معلوم کرنے کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے۔ اصل چیز جو یہاں قرآن مجید بتانا چاہتا ہے وہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح فرشتوں اور جنات کی وفاداری اور اطاعت کا امتحان آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دے کر لیا اسی طرح آدمؑ کی اطاعت و وفاداری کا امتحان ان کے لیے جنت کے درختوں میں سے ایک درخت کو حرام ٹھہرا کر لیا۔ نعمتوں سے بھری ہوئی اس جنت میں صرف ایک درخت ایسا تھا جس سے فائدہ اٹھانے سے حضرت آدمؑ کو روکا گیا تھا لیکن انسان کی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ جس چیز سے وہ روک دیا جاتا ہے اسی کا وہ زیادہ حریص بن جایا کرتا ہے۔ چنانچہ ابلیس نے آدمؑ کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور ان کو یہ سمجھانا شروع کر دیا کہ زندگی جاوداں اور ملک لازوال کا راز اگر مضمر ہے تو بس اسی درخت کے پھلوں میں ہے جس سے ان کو محروم کر دیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آدمؑ شیطان کے اس چکمے میں آ گئے اور اس درخت کا پھل کھا بیٹھے۔ لیکن یہ غلطی کر گذرنے کے بعد شیطان کی طرح اپنی غلطی پر ضد نہیں کی بلکہ اس پر نادم ہوئے اور توبہ کی۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۱۲) او الجن ایضا کانوا مامورین مع الملئکۃ لکنہ استغنی بذکر الملئکۃ عن ذکرھم فانہ اذا علم ان الاکابر مامورون بالتذلل لاحد والتوسل بہ علم ان الاصاغر ایضا مامورون بہ والضمیر فی فسجدوا راجع الی القبیلتین (یا جن بھی فرشتوں کے ساتھ سجدہ کے حکم میں شامل تھے لیکن فرشتوں کے ذکر کے بعد جنات کے ذکر کی ضرورت اس وجہ سے باقی نہیں رہی کہ جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ بڑوں کو کسی کی تعظیم و تکریم کا حکم ہوا ہے تو اس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ چھوٹے بھی اس حکم میں شامل ہیں اس صورت میں فسجدوا کی جو ضمیر ہے وہ دونوں گروہوں کی طرف لوٹے گی۔)

بالکل اسی طرح کی صورت حال اس دنیا میں ہمارے سامنے ہے۔ اس زمین کی ہر نعمت ہمارے لیے مباح ہے۔ صرف گنتی کی چند چیزیں ہیں جن سے خدا نے ہمیں روکا ہے لیکن ہم میں سے بہتوں کا حال یہ ہے کہ وہ شیطان کی وسوسہ اندازیوں کے سبب سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری اور دنیا کی ساری ترقی اور کامیابی کا راز بس انہی چند چیزوں کے اندر چھپا ہوا ہے جن سے خدا نے روک دیا ہے اور پھر ستم یہ ہے کہ نافرمانی کرکے اپنے باپ کی طرح نادم ہونے اور توبہ کرنے کے بجائے ابلیس کی طرح اکڑتے اور ضد کرتے ہیں۔

تورات میں اس درخت کو خیر و شر کی معرفت کا درخت کہا گیا ہے۔ یہ بات ہے تو دلچسپ لیکن ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ غالباً اہل تورات نے یہ بات اوّل اوّل بطور ایک تاویل کے اس وجہ سے اختیار کی ہوگی کہ اس درخت کے پھل کھانے کا اثر یہ بیان کیا گیا ہے کہ آدم و حوا دونوں ننگے ہو کے رہ گئے۔ ابتداءً تو یہ بات ایک تاویل کی حیثیت سے سامنے آئی ہوگی لیکن بعد میں دل پسند ہونے کے سبب سے تحریف کے چور دروازے سے اس نے اصل متن کی جگہ حاصل کر لی ہوگی۔ قرآن مجید نے اس بات کا ذکر تو کیا ہے کہ اس درخت کے پھل کھانے کے بعد آدمؑ ننگے ہو گئے لیکن قرآن سے یہ اشارہ نہیں نکلتا کہ یہ ننگے ہو جانا ان کے اندر دفعتہً عقل و شعور کے بیدار ہو جانے کا نتیجہ تھا بلکہ یہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے خدا کی نافرمانی کرکے اپنے اوپر جو ظلم کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جنت کے لباس سے محروم ہو گئے۔

اگر آدمؑ اس درخت کے پھل کھانے سے پہلے اتنے بے شعور تھے کہ ان کو اپنی ستر کا بھی کوئی احساس نہیں تھا تو اس وقت ان کا کسی امتحان میں ڈالا جانا اور وہ بھی ابلیس جیسے زیرک دشمن کے ہاتھوں ایک بالکل خلاف عقل بات معلوم ہوتی ہے۔ اس امتحان سے پہلے ان کے اندر اتنی سوجھ بوجھ کا ہونا تو ناگزیر تھا کہ وہ شیطان کی وسوسہ اندازیوں کے مقابل میں اپنے خیر و شر کو سمجھ سکیں۔ اگر وہ اس سوجھ بوجھ سے عاری تھے تو ان کا شیطان کے فتنے میں پڑ جانا بالکل واضح تھا اور خدا کے انصاف سے یہ بات بالکل بعید ہے کہ وہ ان کو شیطان کے مقابل میں لا کھڑا کرتا اور پھر ان کی لغزش پر ان کی گرفت کرتا۔

اھبطوا بعضکم لبعض عدو | اھبطوا کا یہ خطاب حضرت ابن عباسؓ اور بعض دوسرے اہل تاویل کے نزدیک حضرت آدم، حوا اور ابلیس سے ہے اور ابن زید کے نزدیک آدم و حوا اور ان کی ذریت سے۔ ہمارے نزدیک ان میں سے صحیح تاویل حضرت ابن عباسؓ کی ہے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہاں یہ جو فرمایا کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے تو یہ دشمنی اپنی فطری بنیاد اگر رکھتی ہے تو آدم اور ابلیس کے اندر ہی رکھتی ہے، آدم وحوا کے اندر نہیں رکھتی۔ آدم وحوا کے درمیان تو فطری ربط الفت اور مودت کا ہے۔ اسی طرح اولاد آدم کے اندر بھی فطری ربط وتعلق دراصل اخوت اور محبت کا ہے۔ ان کے اندر دشمنی اور عداوت کا بیج اگر پڑتا ہے تو شیطان کی کوششوں سے پڑتا ہے اور اسی کی فساد انگیزیوں سے یہ پرورش بھی پاتا ہے۔ انسان کی اپنی فطرت کے اندر اس تخم فساد کی پرورش کے لیے کچھ زیادہ صلاحیت نہیں ہے۔ شیطان اور آدمؑ کی اس فطری عداوت کا ذکر قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا بھی ہے۔ مثلاً :-

فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ (۱۱۷) طٰہٰ

ہم نے کہا اے آدم یہ ابلیس تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے تو کہیں یہ تمہیں جنت سے نکلوا نہ چھوڑے۔

اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ (۵۰ کہف)

تو کیا تم ابلیس اور اس کی اولاد کو میرے بالمقابل اپنا دوست بناؤ گے حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔

اولاد آدم میں سے اگر بہت سے لوگ ابلیس اور اس کی ذریت سے دوستی قائم کر لیتے ہیں۔ تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے درمیان فطری تعلق درحقیقت دوستی ہی کا ہے۔ فطری تعلق تو ان کے درمیان دشمن کا ہے اور دشمنی ہی کا رہنا چاہیے، جیسا کہ اوپر کی کہف والی آیت سے اشارہ نکلتا ہے لیکن بہت سے لوگ اپنی نادانی اور ناعاقبت اندیشی کے سبب سے اپنے دشمنوں ہی کو اپنا دوست سمجھ بیٹھتے ہیں اور ان کے آلہ کار بن کر خود اپنے آپ کو تباہ کر لیتے ہیں۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں دوسرے مقامات میں اس بات کی تصریح ہے کہ جس طرح آدم کو جنت سے نکلنے کا حکم دیا گیا تھا اسی طرح ابلیس کو بھی بعینہٖ انہی الفاظ میں یہ حکم دیا گیا تھا۔ سورہ اعراف میں ہے، قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ (خدا نے کہا تو یہاں سے اتر، تجھے کوئی حق نہیں ہے کہ تو یہاں گھمنڈ کرے، سو تو نکل، تو ذلیل ہونے والوں میں سے ہوگا)

تیسری وجہ یہ ہے کہ بعض جگہ اس حکم کے ساتھ جمیعاً کا لفظ بطور تاکید کے آیا ہے۔ مثلاً سورہ طٰہٰ میں ہے اهبطا منها جميعا، خود اس سورہ میں بھی آگے چل کر ہے قلنا اهبطوا منها جميعا۔ اگر یہ

خطاب صرف آدم و حوا سے مانا جائے تو پھر جمیعاً کا لفظ کچھ غیر ضروری سا ہو کے رہ جاتا ہے۔ اور اگر اس کو مفید بنانے کے لیے یہ فرض کیا جائے کہ آدم و حوا کے ساتھ یہ حکم ان کی اولاد کے لیے بھی تھا تو یہ ایک تکلف سا ہوگا، کیونکہ ذریت آدم کے متعلق اس مرحلے تک اگر کوئی بات سامنے آئی ہے تو صرف اس حد تک آئی ہے کہ ان سے خدا کی ربوبیت کا اقرار لیا گیا اور آدم اور فرشتوں کو ان کا مشاہدہ کرایا گیا۔ یہ ماننے کے لیے قرآن میں مشکل ہی سے کوئی دلیل مل سکے گی کہ آدم کی ذریت آدم کے ساتھ جنت میں تھی بھی اور وہ باپ کے گناہ میں جنت سے نکالی بھی گئی۔

رہی یہ بات کہ بعض جگہ قرآن مجید میں مثنیٰ کا صیغہ استعمال ہوا ہے اور یہ ایک واضح دلیل ہے اس بات کی کہ خطاب حضرت آدمؑ اور حوا ہی سے ہو تو ہمارے نزدیک یہ دلیل بھی کچھ زیادہ وزنی نہیں ہے۔ بلاشبہ بعض جگہ مثنیٰ کا صیغہ استعمال ہوا ہے مثلاً اِهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا ۖ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ (۲۳، طٰہٰ) (اس سے اترو سب، تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے، پس اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے وہ نہ تو گمراہ ہوں گے اور نہ محروم۔

لیکن یہ مثنیٰ کا صیغہ حضرت آدمؑ اور حوا کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ سیاق و سباق دلیل ہے کہ یہ آدم اور ابلیس دونوں کو بحیثیت دو فریقوں اور دو پارٹیوں کے خطاب کر رہا ہے۔ اور یہاں ہدایت کی پیروی کے بارے میں جو حکم ہے وہ جس طرح بنی نوع انسان کے لیے موزوں ہے اسی طرح بنی نوع جن کے لیے بھی موزوں ہے۔

فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ | توبہ کے معنی رجوع کرنے کے ہیں۔ جب اس کا صلہ علیٰ کے ساتھ آتا ہے تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر رحم کا مضمون چھپا ہوا ہے۔

"فتلقیٰ" کے لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کے یہ الفاظ حضرت آدم علیہ السلام کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے۔ دوسری جگہ قرآن مجید میں ان الفاظ کا حوالہ بھی ہے۔ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۲۳۔ اعراف (اور ان دونوں نے دعا کی کہ اے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور ہم پر رحم نہ فرمائے گا تو

ہم برباد ہونے والوں میں سے بن جائیں گے)

توبہ کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کا بے قرار ہونا اور توبہ کے الفاظ کا ان کے دل میں ڈالا جانا اللہ تعالیٰ کی اس سنت کا پتہ دیتا ہے جو توبہ سے متعلق اس نے پسند فرمائی ہے۔ وہ سنت یہ ہے کہ بندہ جب کوئی گناہ کر گذرتا ہے تو ندامت و شرمندگی اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا ایک احساس اس کے اندر خود بخود ابھرتا ہے، یہ احساس اس کی فطرت کا ایک تقاضا ہے۔ اور یہ اس وقت تک برابر ابھرتا رہتا ہے جب تک انسان غلطیوں اور گناہوں پر اصرار کر کے اپنے اس احساس کو بالکل کچل کے نہ رکھ دے۔ اسی خاص کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر نفس لوامہ کو ودیعت فرمایا ہے۔ اس سے متعلق ضروری تفصیلات مناسب مواقع پر آئیں گی۔

قلنا اهبطوا منها جميعاً | یہ الفاظ دو مرتبہ دہرائے گئے ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت آدمؑ کی لغزش کے بعد۔ پھر دوبارہ ان کی توبہ کے بعد۔ لغزش کے بعد اس کا ذکر اس لغزش کا نتیجہ بیان کرنے کے لیے ہوا ہے اور توبہ کے بعد اس امتحان کی حکمت بیان کرنے کے لیے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اب تمہیں دنیا میں بھیج کر تمہارا امتحان کرنا چاہتا ہے تاکہ تمہارے برے اور بھلے میں امتیاز ہو سکے تو جو اس امتحان میں پورے اتریں گے وہ اس جنت کے وارث ہوں گے، اور جو اس امتحان میں فیل ہو جائیں گے وہ اس جنت سے محروم رہیں گے۔

فاما یاتینکم منی هدی | یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت آدمؑ اور ان کی ذریت کے لیے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری کرنے کا پہلا وعدہ ہے۔ حضرت آدم کی لغزش سے انسانی فطرت اور انسانی عقل کا وہ ضعف ظاہر ہو گیا جو انسان کو وحی الٰہی کی رہنمائی اور انبیا علیہم السلام کی دستگیری کا محتاج ثابت کرتا ہے۔ چنانچہ انسان کی اس کمزوری پر نگاہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بطور تسکین و تسلی یہ وعدہ فرمایا کہ وہ خود اپنی طرف سے انسان کی رہنمائی کے لیے روشنی بھیجے گا تو جو لوگ اس روشنی کی قدر کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ کوئی غم۔

"نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ کوئی غم" کے الفاظ قرآن مجید میں جنت کی تعبیر کے لیے خاص ہیں۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ جنت کی تعبیر کے لیے یہ الفاظ بہت جامع ہیں۔ خوف کسی پیش آنے والے خطرے کا ہوا کرتا ہے اور حزن ماضی یا حاضر کے کسی خسارہ کا ایسی جگہ، جہاں نہ ماضی کا کوئی غم ہو

(باقی صفحہ ۲۷ پر)

مطالعۂ حدیث

مولانا عبدالغفار حسن صاحب

معازف و مزامیر کا شرعی حکم

اس سلسلۂ مضامین کی ترتیب میں مشہور شارحین حدیث اور امام ابن تیمیہؒ اور ان کے ارشد تلامذہ کی تصانیف سے استفادہ کیا گیا ہے۔

زیادہ تر ایسی احادیث کی تشریح کو ملحوظ رکھا گیا ہے

(۱) جن سے اسلام کے بنیادی عقائد و اقدار پر روشنی پڑتی ہو۔

(۲) جن روایات سے تعمیر سیرت اور دینی تربیت کا پہلو نمایاں ہو۔

(۳) ایسی روایات کی صحیح اور معقول تشریح جن کو قرآن یا عقل و تجربہ کے خلاف قرار دے کر رد کر دیا جاتا ہے۔

(۴) ایسی روایات کی صحیح تاویل و تشریح جو بظاہر متعارض اور متصادم معلوم ہوتی ہیں۔

(۵) ایسی روایات و آثار کی وضاحت جو اپنے ظاہری مفہوم کے لحاظ سے حدیث کی حجیت اور اہمیت کو کم کرتی ہوں۔

(۶) ایسی احادیث کی مستند توضیح جن کو آج کے اصحابِ تجدد مغربی ثقافت کو فروغ دینے کے لیے غلط معنی پہناتے ہیں۔ (ع ح)

قال حدثنی ابو عامر او ابو مالک الاشعری واللہ ما کذبنی سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول: لیکونن من امتی اقوام یستحلون الحر والحریر والخمر والمعازف ولینزلن اقوام

لہ گانے بجانے کے آلات

الیٰ جنب علم یروح علیهم بسارحة لهم، یاتیهم یعنی الفقیر لحاجة فیقولوا ارجع الینا غداً فیبیتهم الله ویضع العلم ویمسخ آخرین قردة وخنازیر الیٰ یوم القیامة

ترجمہ : ابو عامر یا ابو مالک (یہ دونوں صحابی ہیں) کے شاگرد عبدالرحمٰن بن غنم الاشعری کا بیان ہے کہ مجھ سے (ان دونوں میں سے ایک نے) حدیث بیان کی ، بخدا انھوں نے مجھ سے جھوٹ بات نہیں کی۔ انھوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا کہ میری امت میں ایسے لوگ (یا گروہ) پیدا ہوں گے جو زنا ، ریشم شراب اور گانے بجانے کے آلات کو حلال قرار دیں گے اور کچھ لوگ پہاڑ کے دامن میں اتریں گے جہاں ان کے پاس شام کو مویشی چر کر پہنچیں گے ، ان کے پاس کوئی آدمی اپنی کسی ضرورت وحاجت کو لے کر آئے گا تو وہ کہیں گے "کل آنا" تو اللہ تعالیٰ ان کو راتوں رات عذاب میں مبتلا کردے گا ، پہاڑ ان پر گرا دے گا ، اور دوسروں کو قیامت تک کے لیے بندر سور بنا دے گا ۔

تحقیق سند | بخاری کی اس روایت کو حافظ ابن حزم کے سوا تمام قابل ذکر اہل علم محدثین اور فقہا نے صحیح تسلیم کیا ہے ۔

علامہ عینیؒ لکھتے ہیں :

والحدیث صحیح وان کانت صورته صورة التعلیق وقد تقرر عند الحفاظ ان الذی یأتی به البخاری من التعالیق کلها بصیغة الجزم یکون صحیحاً الیٰ من علقه عنه ولو لم یکن من شیوخه فان قلت قال ابن حزم هذا الحدیث منقطع فیما بین البخاری وصدقة بن خالد والمنقطع لا تقوم به حجة ۔ قلت وهم ابن حزم فی هذا

عمدۃ القاری شرح بخاری ، کتاب الاشربہ
ج ۲۱ ص ۱۷۵

حدیث صحیح ہے [illegible] اگرچہ بظاہر معلق [illegible] کیونکہ حفاظ حدیث کے ہاں یہ بات طے شدہ ہے کہ بخاری میں جتنی معلق[1] روایات جزم ویقین کے ساتھ منقول ہیں وہ قابل اعتماد ہیں اور جن سے تعلیق کی گئی ہے ان کی طرف حدیث کی نسبت درست ہے ، خواہ وہ امام بخاری کے شیوخ میں سے نہ بھی ہوں ۔ اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ امام بخاری اور صدقہ بن خالد کے درمیان انقطاع پایا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ منقطع روایت حجت نہیں ہوسکتی تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں انقطاع کا شبہ پیدا کرنا وہم سے خالی نہیں ہے ، یعنی یہ شبہ بے بنیاد ہے

[1] محدثین کی اصطلاح میں معلق روایت اُسے کہتے ہیں جس کی سند کا ابتدائی حصہ یا پوری سند حذف (باقی اگلے صفحہ پر)

حافظ ابن الصلاحؒ نے بھی ابن حزمؒ کے اس موقف کو انتہائی کمزور قرار دیا ہے، لکھتے ہیں :-

فزعم ابن حزم انه منقطع بين البخاري وهشام وجعله جواباً عن الاحتجاج به على تفهيم المعارف واخطأ في ذلك من وجوه والحديث صحيح معروف الاتصال على شرط الصحيح۔

ابن حزمؒ نے بخاری کی اس روایت کو منقطع قرار دے کر حرمت معارف و مزامیر کے استدلال کا جواب دینا چاہا ہے، حالانکہ حدیث، بخاریؒ کی شرط کے مطابق صحیح اور متصل الاسناد ہے۔ ابن حزمؒ نے اس دعوئ انقطاع میں کئی وجوہ سے غلطی کی ہے۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مقدمہ ابن الصلاح صـ۳۲)

حافظ ابن القیمؒ نے اس شبہ کا جواب تفصیل کے ساتھ دیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ شبہ کئی وجوہ کی بنا پر لیے بنیاد ہے۔

(۱) امام بخاری کی ملاقات اور سماع ہشام بن عمار سے ثابت ہے اس لیے یہاں تدلیس کا شبہ پیدا کرنا کسی صورت میں بھی ممکن نہیں ہے۔

(۲) امام بخاری کا صیغہ تمریض "قیل" کے بجائے پورے ثوق کے ساتھ اس روایت کو بیان کرنا ظاہر کرتا ہے کہ ان کو اس روایت کی صحت پر پوری طرح یقین ہے۔

(۳) امام اسماعیلی اور دوسرے محدثین نے دوسرے طرق سے سند کا اتصال واضح کر دیا ہے جس سے انقطاع کا شبہ کسی صورت میں بھی باقی نہیں رہتا، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اغاثۃ اللہفان فی مکائد الشیطان صـ۲۳۹۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس سلسلہ میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ فتح الباری مصری ج ۱۰ صـ۴۳ کتاب الاشربہ۔

اس موقع پر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ حافظ ابن حزمؒ کا اپنی رائے پر اصرار و تشدد اہل علم کے طبقہ میں معروف و مشہور رہے۔ اسی تشدد کی بنا پر وہ متعدد مسائل میں دوسرے اہل علم سے منفرد ہو گئے ہیں، اس لیے ایک فرد کا اختلاف و شذوذ جب کہ اس کی بنیاد کسی معقول استدلال پر بھی نہیں ہے کوئی معنیٰ نہیں رکھتا، اس تفصیل کے بعد اس قول کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی کہ معارف

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱) کردی جائے صحیح بخاری کی ایسی معلق روایات متصل السند کے حکم میں مانی جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہو صـ۳ مقدمہ مشکوٰۃ از شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔

دمزامیر کی حرمت پر کوئی حدیث بھی صحیح نہیں ہے۔

الفاظ حدیث کی تحقیق (۱) حِر (بالحاء والراء المخففہ) فرج، شرمگاہ، یہاں مراد زنا ہے، جن راویوں نے حَزّ (بالخاء والزاء) روایت کیا ہے، یہ بھی ریشم کی ایک قسم ہے (اغاثۃ اللہفان ص۱۴۰) لیکن لفظ "حِر" پر راویانِ حدیث نے زیادہ اعتماد کیا ہے، اور اسی کو ترجیح دی ہے، یہاں سیاق وسباق کے لحاظ سے بھی یہی مناسب ہے۔ فتح الباری ج ۱۰ ص۴۵

(۲) معازف، یہ لفظ مَعْزِفہ کی جمع ہے۔ اس کا اطلاق گانے بجانے کے آلات پر کیا جاتا ہے۔ لغت حدیث کے عالم ابن الاثیر نے لکھا ہے وھی الدفوف وغیرھا مما یُضرب یعنی دف اور جن آلات کو بجایا جاتا ہے ان کو معازف کہا جاتا ہے۔

مولانا وحید الزماں صاحب مرحوم لکھتے ہیں، یستحلّون الحِرَّ والمعازف، یعنی زنا اور باجوں کو حلال سمجھیں گے۔ انوار اللغہ ج ۱۸ ص۱۰۴[1]

حافظ ابن حجر "معازف" کی تشریح میں لکھتے ہیں:-

ھی آلات الملاھی، ونقل القرطبی عن الجوھری ان المعازف ھو الغناء والذی من صحاحہ انھا آلات اللھو	یعنی معازف آلات لہو کا نام ہے۔ امام قرطبی نے جوھری سے نقل کیا ہے کہ معازف غناء کا نام ہے۔ صحاح جوھری میں معازف آلات لہو کے معنی میں لیا گیا ہے۔
فتح الباری مصری ج ۱ ص۴۵	

مذکورہ بالا تشریحات میں صرف تعبیر کا اختلاف ہے۔ معازف سے اصل گانے بجانے کے آلات مراد ہیں۔ اور ایک تشریح کے مطابق غناء (گانے) پر بھی اس کا اطلاق کیا گیا ہے۔

(۳) یستحلّون، استحلال کے معنی ہیں کسی چیز کو حلال قرار دینا، یعنی ایک تو گناہ کرنا پھر اس کو حلال طیب سمجھنا۔ یہ دین سے بغاوت کی انتہائی افسوسناک شکل ہے۔ اس سے جرم کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

آج کل صورت حال یہی ہے کہ جس چیز کو شریعت میں حرام ٹھہرایا گیا ہے اس کو بے تکلف

---

[1] واضح رہے کہ یہ لغت، عربی کی مستند لغات لسان العرب، قاموس نہایۃ ابن الاثیر، مجمع البحار، صحاح جوہری، الفائق اور منتہی الارب سے مرتب کی گئی ہے۔

جائز اور حلال قرار دیا جا رہا ہے۔

تشریح حدیث (۱) زنا، ریشم[1]، شراب اور آلات طرب و غناء حرام ہیں۔ اول الذکر تینوں محرمات کے بارے میں ابھی تک کوئی ایسا شوشہ نہیں چھوڑا جا رہا ہے جس سے یہ امور بھی متنازع فیہ مسائل کی حیثیت اختیار کر جائیں، اس لیے اس مضمون میں صرف معازف و مزامیر کی حلت و حرمت ہی تک گفتگو محدود رکھی جا رہی ہے۔

(۲) اس روایت میں جن چار چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں باہمی خاص تعلق اور مناسبت پائی جاتی ہے۔ یہ چاروں اشیاء تعیش پسند معاشرے کے ناگزیر لوازمات میں سے ہیں۔

موسیقی کے نتائج جب کسی سوسائٹی کے افراد کو تن آسانی اور عیش پسندی کا چسکا پڑ جاتا ہے تو بدن نرم و نازک ریشمیں لباس مانگتا ہے، کان حسین و دلکش نغمے سننا چاہتا ہے، دل، دماغ نشہ آور اور مدہوش کر دینے والے مشروبات کا مطالبہ کرتے ہیں، نگاہیں حسین چہروں کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں، اس "ذوق جمالیات" یا بالفاظ دیگر ذہنی آوارگی اور اخلاقی بے راہ روی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنی خواہشوں کے پیچھے پیچھے اسی منزل پر پہنچ جاتا ہے جسے آزاد محبت FREE LOVE کہا جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے زنا اور بدکاری کی سرحد شروع ہو جاتی ہے جس قوم میں یہ بیماری پھیل جاتی ہے وہ روحانی، اخلاقی، اور جسمانی ہر لحاظ سے تباہی و بربادی کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی، حدیث میں ہے۔ مافشا الزّنا فی قومٍ الّا کثُر فیھم الموت (موطا امام مالک) یعنی جس قوم میں زنا کاری عام ہو جاتی ہے اس کی شرح اموات میں بھی بالآخر اضافہ ہو کر ہی رہتا ہے۔

اسی بنا پر صلحائے امت کی اصطلاح میں غناء کو "رُقیۃ الزنا" کہا جاتا ہے یعنی غناء، زنا اور بدکاری کا افسوں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حدیث میں غناء کو نفاق کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں، ان الغناء ینبت النفاق فی القلب ابوداوٗد مع عون ج ۴ صفحہ ۴۴ ابوداوٗد کی اس روایت کے بارے میں محدثین کا فیصلہ اگرچہ یہ ہے کہ اس کا مرفوع (ارشاد نبوی)

---

[1] ریشم مردوں کے لیے حرام ہے عورتوں کے لیے مباح ہے جیسا کہ دوسری روایات میں وضاحت موجود ہے۔

ہونے کے بجائے حدیث موقوف یعنی قول صحابی ہونا زیادہ راجح ہے، تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ محدثین کے نزدیک ایسی موقوف روایت جس میں اجتہاد کی گنجائش نہ ہو مرفوع کے حکم میں ہوتی ہے۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں وھو فی حکم المرفوع اذ مثلہ لا یقال من قبل الرای، روح المعانی ج ۲۱ ص۶ شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا ہم تک پہنچنا ان روایات پر موقوف ہے جو سند متصل یا عنعنہ کے ذریعہ منقول ہوں قطع نظر اس سے کہ وہ خود آنحضرت کے الفاظ ہوں جن کو حدیث مرفوع کہتے ہیں یا کسی صحابی پر جاکر روایت ختم ہوجاتی ہو جسے حدیث موقوف کہتے ہیں یا بالفاظ دیگر وہ اس قسم کی خبریں ہوں جو صحابہ اور تابعین کی جماعت میں سے ان قابل سند اشخاص سے منقول ہوں جن کے متعلق یہ یقین ہو کہ جب تک انھوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں نہ سنا ہو وہ از خود کہنے کی جرأت نہیں کریں گے، اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ حدیث موقوف بھی بطریق دلالت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا قول ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص۱۰۵

زنا اور نفاق، قلب کے مریض ہونے کی نشانی ہیں، اور ظاہر ہے کہ غناء زنا کے مبادی اور محرکات میں شمار ہوتا ہے اسی بنا پر اس حدیث میں ان دونوں کو یکجا بیان کردیا ہے، یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح سورہ نور میں زنا کی حد اور ستر کے احکام بیان کرنے کے معاً بعد نفاق اور منافقین کے خصائص بتائے گئے ہیں، یا جیسے سورہ احزاب میں حجاب کے احکام کے ساتھ ساتھ منافقین کا بھی ذکر موجود ہے۔

غنا اور زنا میں مناسبت غناء اور زنا کی باہمی گہری مناسبت اور ان کے تلازم کو امام ابن الجوزی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں "گانے میں دو مضرتیں جمع ہیں ایک طرف تو وہ قلب کو عظمتِ الٰہی میں تفکر سے روکتا ہے۔ دوسری طرف اُسے مادی لذتوں کی طرف راغب کرتا ہے، اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ تمام مادی لذتیں حاصل کرلی جائیں، اور معلوم ہے کہ مادی لذتوں میں سب سے زیادہ قوی مرد اور عورت کے اختلاط کی لذت ہے، مگر یہ لذت اس وقت مکمل ہوتی ہے جب اس میں تجدد و تنوع ہوتا رہے، اور ظاہر ہے کہ حلال طریقے پر یہ تجدد ممکن نہیں، لہٰذا گانا زنا کی ترغیب دیتا ہے، گانے اور زنا میں گہری مناسبت ہے۔ گانا روح کے لیے فتنہ ہے اور زنا نفس

کی سب سے بڑی لذت ہے۔ (تلبیس ابلیس صث۳۲۷) رسالہ السماع والرقص مؤلفہ امام ابن تیمیہ صث۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث میں زنا اور اس کے اسباب و محرکات کو یکجا بیان کر دیا گیا ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس قوم میں عیش پسندی، مزامیر پرستی، شراب خوری اور زناکاری پھیل جاتی ہے اس پر مختلف قسم کے انتہائی شدید عذاب نازل ہوسکتے ہیں جن کا ایک نمونہ قوم لوط اپنے زمانہ میں دیکھ چکی ہے۔

ابن ماجہ کی روایت میں غناء اور سماع کا انجام اس طرح بیان کیا گیا ہے:

لیشربن ناس من امتی الخمر یسمونها بغیر اسمها یعزف علی رؤسهم بالمعازف والمغنیات، یخسف الله بهم الارض ویجعل منهم قردة وخنازیر۔	میری امت میں سے کچھ لوگ شراب کا دوسرا نام رکھ کر اس کا دور چلائیں گے۔ ان کے سروں پر گانے والیوں اور باجوں گاجوں کا شور اور ہنگامہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں دھنسا دے گا، اور ان میں سے بعض کو سور بندر بنا دے گا۔

ایک غلط تاویل بخاری کی زیر غور صحیح حدیث کی بعض حامیانِ موسیقی نے یہ تاویل کی ہے "اس سے انکار نہیں کہ آنحضور دف بجانے پر خاموش رہے خود اسے سنا اور منع نہیں فرمایا جیساکہ صحیح بخاری میں موجود ہے۔ اس بات کا زیر بحث حدیث میں احتمال موجود ہے کہ جن معازف (باجوں) کو حرام کیا گیا ہے وہ وہی باجے ہیں جو مے نوشی کے ساتھ پیوستہ ہوں جیساکہ ایک روایت میں ہے کہ میری امت میں کچھ لوگ شراب پئیں گے، شام کو ان کے پاس گانے والی لونڈیاں آئیں گی اور دن کو باجے بجیں گے۔"

"اس روایت میں اس کا احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد ان تمام چیزوں کی مجموعی شکل ہو۔ اس صورت میں کسی ایک چیز کی انفرادی تحریم کی دلیل نہ ہوگی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت قرآن کی یہ آیات ہیں" اسے پکڑ کر گلے میں طوق ڈالو پھر اسے جہنم میں لے جاؤ پھر ستر گز کے حلقے والی زنجیر میں اسے جکڑ دو۔ یہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتا تھا اور مسکین کے کھلانے پر کسی کو ابھارتا نہ تھا" یہاں بلاشبہ اس وعید شدید کا سبب محض مسکین کو کھلانے پر نہ ابھارنا نہیں ہے اور نہ ایساکرنا یعنی مسکین کو کھلانے پر نہ ابھارنا حرام ہے۔" اسلام اور موسیقی صث۱۷۷، شائع کردہ "ثقافت اسلامیہ"

سلہ اس حدیث کی وضاحت عنقریب قارئین کرام کے سامنے آجائے گی۔

اس تاویل کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کسی محفل میں غناء اور مزامیر کا استعمال ہو اور شراب کا دور نہ چلے تو ایسی مجلس سے لطف اندوز ہونا جائز ہوگا۔

حقیقت میں یہ ایک قسم کا مغالطہ ہے جس حدیث کی بنا پر یہ تاویل کی گئی ہے اس کا منشا تو صرف عیش وطرب کی دلدادہ سوسائٹی کی حالت بیان کرنی ہے۔ بالعموم جہاں گانے بجانے کی گرم بازاری ہوگی وہاں شراب وکباب کا دور بھی چل کر رہے گا اور جنسی بے راہ روی کی وبا بھی پھوٹ کر رہے گی۔ اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ مزامیر کے ساتھ اگر شراب نہ ہوگی تو مزامیر ومعازف حرام نہ ہوں گے۔

اس قسم کی تاویل کا جواب قاضی شوکانیؒ نے نیل الاوطار میں نقل کیا ہے :۔

ویجاب بان الاقتران لایدل علیٰ ان المحرم هو الجمع فقط والا لزم ان الزنا المصرح به فی الحدیث لایحرم الاعند شرب الخمر واستعمال المعازف واللازم باطل بالاجماع فالملزوم مثلہ والضا یلزم فی مثل قولہ تعالیٰ انہ کان لا یؤمن باللہ العظیم ولا یحض علیٰ طعام المسکین انہ لا یحرم عدم الایمان باللہ الاعند عدم الحض علیٰ طعام المسکین، فان قیل تحریم مثل هذه الامور المذکورۃ فی الالزام قد علم من دلیل آخر فیجاب بان تحریم المعازف قد علم من دلیل آخر کما سلف ج ۷ ص ۳۱۸

اس تاویل کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ چند چیزوں کے یکجا بیان ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ حرمت کا اطلاق صرف مجموعی حالت پر ہو ورنہ لازم آئے گا کہ زنا بھی اسی وقت حرام ہو جب کہ اس کے ساتھ شرب خمر اور استعمال مزامیر کا سلسلہ بھی جاری ہو۔ یہ نتیجہ بالاجماع غلط ہے تو ظاہر ہے کہ اصل دعویٰ بھی باطل ہوگا۔ نیز اس تاویل کی رُو سے یہ بھی لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ پر عدم ایمان اسی وقت حرام ہوگا جب کہ انسان مسکین کو کھانا کھلانے پر نہ ابھارے یعنی بخل کا بھی ارتکاب کرے۔ اگر اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ ان چیزوں کی حرمت تو دوسرے دلائل سے واضح ہو چکی ہے تو عرض کیا جائے گا (جواب!) اسی طرح معازف ومزامیر کی حرمت بھی دوسری دلیل سے معلوم ہو چکی ہے جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔

☆

اسی طرح قرآن میں جہاں شراب کو رجس (ناپاک) کہا گیا ہے وہاں ساتھ ہی میسر (قمار بازی) کا بھی ذکر ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجسٌ من عمل الشیطان، فاجتنبوہ	پس شراب، جُوا، اور انصاب (بت) ازلام، (فال دیکھنے کے تیر) ناپاک، شیطانی کارنامہ ہیں ان سے پرہیز کرو۔
سورہ مائدہ آیت (۹۰)	

کیا اس آیت کی یہ تفسیر درست ہوگی کہ جُوا صرف اسی وقت ناپاک اور قابل اجتناب ہوگا جب کے اس کے ساتھ مے نوشی کا شوق بھی فرمایا جائے؟

باقی رہا یہ کہنا کہ مسکین کے کھانا کھلانے پر نہ ابھارنا کوئی حرام کام نہیں ہے کہ جس پر اتنی شدید وعید سنائی جائے، اصل معاملہ یہ ہے کہ جس وقت کوئی انسان فاقہ مست ہو بھوک سے مر رہا ہو تو ایسے موقع پر جو نہ خود آمادہ بجود و کرم ہو اور نہ دوسروں ہی کو اس نیکی پر ابھارے وہ یقیناً انتہائی شدید وعید کا مستحق ہے۔ اسی کے ہم معنیٰ وہ آیت ہے جس میں سرمایہ کو کنز بنانے اور تجوریوں پر ہر وقت قفل چڑھانے والوں کو دردناک عذاب کی بشارت سنائی گئی ہے۔ (سورہ توبہ)

حرمت مزامیر پر دوسری روایات صحیح بخاری کی مذکورہ بالا قابل اعتماد روایت کے علاوہ ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد، طبرانی وغیرہ میں بے شمار ایسی احادیث ہیں جن سے معازف و مزامیر کی حرمت واضح طور پر ثابت ہوتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ ان روایات کی اکثریت پر محدثین نے جرح کی ہے، لیکن مجموعی طور پر یہ سب احادیث ایک دوسرے کی تقویت اور تائید کا ذریعہ بنتی ہیں[1]، اور اس بنا پر یہ روایات قابل اعتماد اور لائق استناد قرار پاتی ہیں، قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں۔

"مجموعی طور پر یہ روایات استدلال کی بنیاد بن سکتی ہیں، خصوصاً جب کہ ان میں سے بعض روایات کو "حسن" تسلیم کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ تمام روایات مجموعی طور پر کم از کم حسن لغیرہ تو شمار ہوں گی

---

[1] واضح رہے کہ ایسی ضعیف روایات جن کا تمام تر مدار ایسے ناقابل اعتماد راویوں پر ہو جو محض حافظہ کے لحاظ سے ہی کمزور نہ ہوں بلکہ ان کو کاذب یا متہم بالکذب بھی قرار دیا گیا ہو، اگر وہ بیسیوں کی تعداد میں بھی ہوں تب بھی لائق استناد نہ ہوں گی لیکن اگر راویوں پر صرف ضعف حافظہ کا الزام ہو تو اس صورت میں ایسی روایات کا مجموعہ حسن قرار دیا جائے گا اور شرعی مسائل میں ان کو حجت مانا جائے گا۔ مقدمہ ابن الصلاح ص۱۷، مقدمہ مشکوٰۃ ص۵

یعنی فی نفسہ صحت کے لحاظ سے معیار بلند نہ سہی مجموعی طور پر لائق استناد بن جاتی ہیں۔
اس کے بعد قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ گانے والی لونڈیوں کی بیع کی ممانعت پر مشتمل روایات متعدد سندوں سے ثابت ہیں۔ اسی طرح الغناء ینبت النفاق" گانا نفاق پیدا کرتا ہے یہ روایت بھی متعدد سندوں اور طریقوں سے مروی ہے، نیل الاوطار ج ۷ ص ۱۳ (باقی آئندہ)

جدید تفسیر سورہ بقرہ

نہ مستقبل کا کوئی خطرہ، جنت ہی ہو سکتی ہے۔

والذین کفروا وکذبوا بآیاتنا | یہ آیت اوپر والی آیت کے بالمقابل ہے۔ اوپر والی آیت میں ان لوگوں کا صلہ بیان ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی ہدایت کی پیروی کریں گے۔ اس آیت میں ان لوگوں کا انجام بیان ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب کریں گے۔

آیات کا لفظ آیت کی جمع ہے۔ آیت کے اصل معنی علامت اور نشانی کے ہیں۔

قرآن مجید میں یہ لفظ ان دلائل اور نشانیوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جو آسمان و زمین اور آفاق و انفس کے ہر گوشے میں موجود ہیں اور جو خدا کی قدرت و حکمت، اس کی توحید اور اس کے قانون جزا و سزا کی گواہی دے رہی ہیں۔

ان معجزات کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جو حضرات انبیائے علیہم السلام کے ذریعے سے ظاہر ہوئے ہیں یا جن کے لیے کفار مطالبہ کرتے رہے ہیں۔

قرآن مجید کی ان آیتوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جن سے قرآن کی سورتیں مرکب ہیں۔ قرآن مجید کی آیات کے لیے اس لفظ کا استعمال اس حقیقت پر دلیل ہے کہ ان کی حیثیت بے دلیل احکامات کی نہیں ہے بلکہ ان میں سے ہر آیت ایک دلیل و شہادت اور ایک حجت و برہان کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔

(باقی آئندہ)

تزکیۂ نفس

امین احسن اصلاحی

تعلق باللہ کی اساسات

—(۲)—

اطاعت عبادت کے ساتھ ساتھ، اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو استوار رکھنے کے لیے اس کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ اسلام میں ہندوئیت اور عیسائیت کی طرح خدا صرف پوجا پاٹ ہی کا حق دار نہیں ہے بلکہ اطاعت اور فرمانبرداری کا بھی حقدار ہے۔ اطاعت سے مطلب ان قوانین و احکام کی اطاعت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے اپنے بندوں کی انفرادی زندگی کی درستگی اور ان کی اجتماعی زندگی کی تنظیم کے لیے اتارے ہیں۔

اس اطاعت کے لیے سب سے پہلے تو عقل مطالبہ کرتی ہے کیونکہ یہ بات بالبداہت عقل کے خلاف ہے کہ انسان جس ہستی کو اپنی عبادت کا مستحق تسلیم کرے، اس کے احکام و قوانین کی اطاعت سے بے پروا رہے یا ان کا انکار کرے۔ اگر معبود ہستی نے کوئی حکم اور قانون دیا ہی نہ ہو (جس کا معبود حقیقی کے بارے میں تصور نہیں کیا جا سکتا) تب تو اور بات ہے لیکن اس معبود ہستی نے اگر کچھ احکام و قوانین دیئے ہیں تو انسان کی عقل اس سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ جس کو عبادت کا مستحق سمجھتا ہے اسی کو اطاعت کا بھی مستحق سمجھے۔ عبادت کسی کی کرنا اور اطاعت کسی اور کی کرنا دونوں باتوں میں ایک کھلا ہوا تضاد ہے جس پر صرف وہی شخص مطمئن ہو سکتا ہے جس کی عقل میں بہت بڑا فتور واقع ہو گیا ہو۔

دوسرے درجہ میں اس کا مطالبہ، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اسلام کی ظاہری شکل و صورت کرتی ہے۔ اسلام کو جو شخص تھوڑا بہت بھی جانتا ہے وہ اس حقیقت سے کسی طرح بھی انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ اسلام کے خدا نے صرف اپنی پرستش ہی کا مطالبہ نہیں کیا ہے بلکہ اپنی اطاعت کا بھی

مطالبہ کیا ہے۔ اس نے لوگوں کو نماز پڑھنے، روزہ رکھنے اور زکوٰۃ دینے ہی کے احکام نہیں دیئے بلکہ معاملات، کاروبار، زراعت، تجارت، سیاست سے متعلق بھی بہت سے واضح اور قطعی احکام و قوانین دیئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ احکام و قوانین اس نے اسی لیے دیئے ہیں کہ ان کی اطاعت کی جائے، اگر ان کی اطاعت مطلوب نہیں ہے تو پھر ان احکام کے دینے کا فائدہ ہی کیا؟ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۴۴ - مائدہ

اور جو لوگ اس شریعت کے مطابق فیصلے نہ کریں جو اللہ نے اتاری ہے تو وہی لوگ کافر ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۴۵ - مائدہ

اور جو لوگ اس کے مطابق فیصلے نہ کریں جو اللہ نے اتارا ہے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۴۷ مائدہ

اور جو لوگ اس کے مطابق فیصلے نہ کریں جو اللہ نے اتارا ہے تو وہی لوگ فاسق ہیں۔

اسی وجہ سے قرآن مجید میں صرف اعبدوا ربکم ہی کا حکم نہیں آیا ہے بلکہ بار بار اطیعوا اللہ کا حکم بھی آیا ہے جس کے معنی یہی ہیں کہ اللہ کے قانون کی اطاعت کرو۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۳۲ - آل عمران

کہہ دو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی پس اگر وہ اس اطاعت سے اعراض کریں تو اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

●

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۵۹ نساء

اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے اولوالامر کی۔

اس اطاعت کی عملی شکل درحقیقت رسول کی اطاعت ہے اس لیے کہ رسول ہی ہے جو خدا کے نائب کی حیثیت سے خدا کے احکام و قوانین سے باخبر کرتا اور ان کی تنفیذ کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی اطیعوا اللہ وارد ہے ساتھ ہی اطیعوا الرسول کا بھی حکم ہے۔ اس وجہ سے خدا اور

رسول کے درمیان فرق کرنے کے لیے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن رسول کی اطاعت تسلیم نہیں کرتے ان کی مثال بالکل ایسی ہے کہ وہ بادشاہ کی اطاعت تو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کے مقرر کیے ہوئے نائب کی اطاعت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی خود مختاری کی گنجائش نہ تو دنیا کے قوانین میں کہیں تسلیم کی گئی ہے اور نہ خدا ہی نے اپنے قانون میں اس کے جواز کی کوئی گنجائش رکھی ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا

۶۵ ۔ نساء

پس نہیں، تیرے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہیں ہیں جب تک یہ لوگ تمہارا فیصلہ قبول کریں ان نزاعات کے درمیان جو ان کے درمیان پیدا ہوں، پھر وہ اپنے دلوں میں تمہارے فیصلہ سے کوئی تنگی بھی نہ محسوس کریں اور پوری طرح تمہاری اطاعت کریں۔

●

اللہ تعالیٰ نے اپنی اس اطاعت سے دو شکلوں کے سوا کسی شکل میں بھی انحراف کی گنجائش نہیں رکھی ہے۔ ایک بھول چوک یا کسی جذبہ سے مغلوبیت۔ دوسرے مجبوری۔ پہلی صورت کا علاج استغفار اور توبہ اس نے بتایا ہے اور دوسری صورت کا علاج امکان کے حد تک اس مجبوری کی اصلاح یا اس سے نکلنے کی جدوجہد۔ ان شکلوں کے سوا خدا کی اطاعت سے انحراف اختیار کرنے والا اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق ہی منقطع کر لیتا ہے۔

مسلمان جہاں کہیں بھی اس پوزیشن میں ہوں کہ وہ خدا کے قانون کا نفاذ کر سکیں ان کے اوپر یہ واجب ہے کہ وہ خدا ہی کے قانون کو نافذ کریں اور اسی کی اطاعت کریں۔ جو نظام خدا اور رسول کے قانون پر مبنی ہو اور خدا و رسول کے احکام ہی کے نفاذ کے لیے وجود میں آیا ہو اسلام میں اس کا درجہ بہت اونچا ہے۔ اس نظام کے چلانے والے اولوالامر درحقیقت رسول کے خلفا کی حیثیت رکھتے ہیں اس وجہ سے ان کی اطاعت واجب ہے۔ اوپر ہم نے سورہ نساء والی آیت جو نقل کی ہے اس میں اولوالامر سے ایسے ہی اولوالامر مراد ہیں۔ ایسے اولوالامر کی اطاعت سے اگر کوئی شخص انحراف اختیار کرے تو وہ گویا خدا اور رسول کی اطاعت سے انحراف اختیار کرتا ہے۔ ایک حدیث ملاحظہ ہو:۔

عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من اطاعنی فقد اطاع الله ومن اطاع الامام فقد اطاعنی ومن عصانی فقد عصی الله ومن عصی الامام فقد عصانی

ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے صاحب امر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی۔ اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے صاحب امر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

•

اس حدیث سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ خدا کی اطاعت کے لیے رسول کی اطاعت ضروری ہے اور رسول کی اطاعت کے لیے اسلامی نظام کے صاحب امر کی اطاعت شرط لازم جس نے رسول کی اطاعت نہیں کی اس نے خدا کی اطاعت نہیں کی اور جس نے صاحب امر کی اطاعت نہیں کی وہ رسول کی اطاعت سے محروم رہا۔

اسلامی نظام اطاعت کی یہ تینوں کڑیاں ایک دوسری سے الگ نہیں کی جا سکتی ہیں۔ یہ تینوں درحقیقت ظاہر میں تین ہیں اور الگ الگ نظر آتی ہیں، حقیقت میں یہ تینوں ایک ہی ہیں کیونکہ مقصود بالذات تو درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے بقیہ دونوں تو اس کا وسیلہ و ذریعہ ہیں۔

اسلام نے اپنے نظام اطاعت میں اولوالامر کو یہ بلند منصب جو دیا ہے تو اس منصب کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ وہ خود خدا کے قانون کی اطاعت کریں اور اس کے بندوں کے اندر اسی کے قانون کو جاری و نافذ کریں جس طرح رسولؐ کو یہ بات دل و جان سے زیادہ عزیز و محبوب تھی کہ لوگ خدا کے قانون کی اطاعت کریں اسی طرح انھیں بھی یہ بات محبوب ہو کہ لوگ خدا اور رسول کے احکام کی اطاعت کریں اور جس طرح رسولؐ کے نزدیک یہ چیز مبغوض تھی کہ لوگ اللہ کی اطاعت سے انحراف اختیار کریں اسی طرح ان کے نزدیک بھی یہ چیز مبغوض ہو کہ لوگ خدا اور رسول کی اطاعت سے انحراف اختیار کریں۔

اسی طرح ان کے منصب کا ایک بدیہی تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ نہ تو خود خدا کے قانون کی نافرمانی کریں اور نہ دوسروں کو کسی ایسی بات کا حکم دیں جو خدا کے حکم کے خلاف ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں سے اطاعت کا یہ مطالبہ اس بنیاد پر ہے کہ اس کائنات کا حقیقی حکمراں وہی ہے بندوں کا

حقیقی منصب صرف اطاعت کا ہے اور اگر وہ کوئی تصرف کا حق رکھتے ہیں تو صرف اس کے نائب کی حیثیت سے اس وجہ سے ان کے لیے یہ بات کسی حال میں جائز نہیں ہے کہ وہ اصل حکمران کے حکم کے خلاف کوئی حکم دیں اور اگر وہ ایسا کر بیٹھیں تو وہ اپنا وہ درجہ از خود ختم کر دیتے ہیں جو اسلام نے ان کے لیے تسلیم کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے احکام سخت بھی ہیں اور نرم بھی ہیں۔ ان پر عمل کرنے اور عمل کرانے میں لمبا اوقات نہایت مشکل حالات اور صبر آزما رکاوٹوں سے سابقہ پیش آتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا مطالبہ بندوں سے یہ ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات میں اسی کی اطاعت کریں۔ جو لوگ صرف انہی باتوں میں خدا کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں جن کو وہ اپنی خواہشوں یا مصلحتوں کے مطابق پاتے ہیں جن باتوں کو وہ اپنی خواہشوں اور مصلحتوں کے مطابق نہیں پاتے ان کی اطاعت سے گریز کی راہیں نکالتے ہیں یا ان میں تحریف کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے قبول نہیں فرمایا ہے۔ بلکہ ایسے لوگوں کو اپنے غضب اور اپنی لعنت کا مستحق قرار دیا ہے۔ پچھلی امتوں میں اس کی مثال یہود ہیں۔ یہود نے اللہ تعالیٰ کی شریعت کی بہت سی باتیں اپنی خواہشات اور اپنے مصالح کے خلاف سمجھ کر بدل ڈالیں۔ انھوں نے اپنے گمان کے مطابق خدا کی شریعت کو زمانہ کے حالات کے مطابق ایک ترقی یافتہ شریعت کی شکل میں ڈھالنے کی کوشش کی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت میں ان کی ان اصلاحات کو نہ صرف یہ کہ قبول نہیں فرمایا، بلکہ ان کی اس جسارت کی پاداش میں ان کو اپنی شریعت ہی سے محروم کر دیا اور ان پر لعنت کر دی۔

اخلاص | لیکن عبادت ہو یا اطاعت، اللہ تعالیٰ کے ہاں ان میں سے قبولیت صرف اسی عمل کو حاصل ہوتی ہے جس میں اخلاص ہو۔

اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ جو کام بھی کیا جائے صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہی حاصل کرنے کے لیے کیا جائے۔ اس مقصد کے سوا کسی اور غرض کا اس میں شائبہ نہ ہو۔

لوگوں نے اس کی تعریف اگرچہ مختلف الفاظ میں کی ہے لیکن یہ اختلاف محض الفاظ کا ہے، مدعا سب کا ایک ہی ہے۔

ایک عارف نے اس کی تعریف یہ کی ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ طاعت میں مقصود صرف اللہ

وحدہٗ کی ذات ہو۔

ایک اور بزرگ نے فرمایا۔ اخلاص یہ ہے کہ آدمی اپنے عمل کو مخلوق کے خیال و لحاظ سے بالکل بالاتر رکھے۔

ایک اور عارف کا قول ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ آدمی کے اعمال ظاہر و باطن دونوں میں بالکل یکساں ہوں۔

اسی طرح ایک اور بزرگ کا ارشاد ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ آدمی کی توجہ اس طرح خدا کی طرف ہو جائے کہ وہ اپنے عمل میں خلق کے لحاظ و خیال سے بالا ہو جائے۔

فضیل کا قول ہے کہ لوگوں کے خیال سے عمل کو چھوڑنا ریا ہے، کرنا شرک ہے، اخلاص یہ ہے کہ آدمی ان دونوں فتنوں سے محفوظ رہے[1]

احادیث سے بھی اخلاص کی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے:-

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ اعمال کا انحصار نیتوں پر ہے۔ ہر آدمی کے سامنے اس کی نیت ہی آئے گی جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہوگی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے شمار ہوگی اور جس کی ہجرت کسی دنیوی مقصد کے لیے ہوگی جس کو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے یا کسی عورت کی خاطر ہوگی جس سے وہ نکاح کرنا چاہتا ہے تو اس کی ہجرت اسی مقصد کے لیے ہے۔ (متفق علیہ)

اسی طرح ایک دوسری متفق علیہ حدیث ہے۔

ابو موسیٰ عبداللہ بن قیس اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص اپنی بہادری کی نمائش کے لیے جنگ کرتا ہے، ایک شخص مجرد حمیت کے تحت جنگ کرتا ہے، ایک شخص محض دکھاوے کے لیے جنگ کرتا ہے ان میں سے کس کی جنگ اللہ کی راہ میں ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ کے راستہ میں اس شخص کی جنگ ہے جو اس مقصد کے لیے جنگ کرے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔

اسی طرح ایک اور مشہور حدیث ہے جس میں یہ خبر دی گئی ہے کہ سب سے پہلے تین قسم کے لوگوں پر دوزخ کی آگ بھڑکائی جائے گی ایک قرآن کے وہ قاری جو قاری کہلانے کے لیے قرآن پڑھتے ہیں، دوسرے وہ مجاہد

[1] یہ اقوال مدارج السالکین جلد ۲ صفحہ ۹۱ سے ماخوذ ہیں۔

جو بہادر کہلانے کے لیے جہاد کرتے ہیں۔ تیسرے وہ صدقہ کرنے والے جو اس لیے صدقہ کرتے ہیں کہ لوگوں میں ان کی داد و دہش کی دھوم ہو۔

جو حقیقت ان احادیث میں واضح کی گئی ہے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اخلاص کی یہی اہمیت و حقیقت قرآن مجید میں بھی بیان ہوئی ہے۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ (۵ بینۃ)

اور ان کو نہیں حکم دیا گیا مگر اس بات کا کہ وہ اللہ ہی کی بندگی کریں، اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے یکسو ہو کر۔

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ (۲-۳ زمر)

پس اللہ ہی کی بندگی کرو، اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے۔ آگاہ کہ اطاعت خالص اللہ ہی کے لیے زیبا ہے۔

●

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا گیا ہے۔

قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهُ دِيْنِيْ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ (۱۴-۱۵ زمر)

کہہ دو میں اللہ ہی کی بندگی کرتا ہوں اسی کے لیے دین کو خاص کرتے ہوئے پس تم اس کے سوا جس کو چاہو پوجو

تمام عبادت و اطاعت کی روح اسی اخلاص کو قرار دیا گیا ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (۱۶۲-۱۶۳ - انعام)

کہہ دو میری نماز اور میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی بات کا حکم ملا ہے اور میں تم میں پہلا مسلم ہوں۔

اس اخلاص کے لیے جہاں یہ بات ضروری ہے کہ آدمی کا عمل صرف اللہ کے لیے ہو وہیں یہ بات بھی ضروری ہے کہ اس کا عمل خدا کے حکم اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق ہو۔ یہ چیز اخلاص کی فطرت کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر کوئی شخص کوئی کام نہایت اخلاص کے ساتھ خدا ہی کے لیے کرے لیکن اس کا وہ کام خدا اور رسول کے حکم کے خلاف ہو تو اس کا یہ اخلاص بے معنی بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی توہین ہے۔ اس کا یہ طرز عمل یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ خدا کی پسند و ناپسند کو خود خدا اور رسول سے زیادہ سمجھنے کا زعم

رکھتا ہے اور یہ زعم، غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ گھمنڈ اور شرک دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ اس وجہ سے کوئی عمل جو خدا اور رسول کے حکم کے خلاف ہو، وہ اخلاص کا عمل نہیں قرار پا سکتا اگرچہ وہ کتنے ہی مخلصانہ طور پر انجام دیا جائے۔

فضیل بن عیاض کا ایک قول سننے اور سمجھنے کے قابل ہے۔ ان سے بہترین عمل کی حقیقت پوچھی گئی تو انھوں نے فرمایا کہ بہترین عمل یہ ہے کہ وہ خالص اور لیے لوبھی ہو اور درست بھی۔ جب اس کی مزید تشریح ان سے چاہی گئی تو انھوں نے فرمایا کہ اگر عمل خالص ہو لیکن درست نہ ہو تو وہ خدا کے ہاں قبول نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر عمل درست ہو لیکن خالص نہ ہو جب بھی وہ قبول نہیں ہوتا۔ خدا کے ہاں قبول ہونے کے لیے ضروری ہے کہ عمل خالص بھی ہو اور درست بھی۔ پھر انھوں نے خالص کی یہ تشریح فرمائی کہ وہ صرف اللہ کے لیے ہو۔ اور درست کی یہ تشریح فرمائی کہ وہ سنت کے مطابق ہو۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے نقطہ نظر کی تائید میں چند آیتیں پڑھیں۔

اگر کوئی عمل خدا اور رسول کے حکم کے خلاف مجرد اخلاص کی بنا پر خدا کے یہاں قبولیت کا درجہ حاصل کر سکتا تو رہبانیت کا نظام اللہ تعالیٰ کے ہاں ضرور قبولیت کا درجہ پاتا اس لیے کہ جن لوگوں نے اس نظام کو ایجاد کیا، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کے اخلاص کا حوالہ دیا ہے لیکن ان کے اس اخلاص کے حوالہ کے باوجود ان کی اس ایجاد کو بدعت اور باطل قرار دیا۔

بعض لوگوں کو یہ بات کھٹکتی ہے کہ اگر ایک آدمی بھلائی کے کام کرے لیکن وہ اللہ کے لیے نہ کرے یا اللہ کے ساتھ اس میں دوسروں کو بھی شریک کرلے تو آخر اس کے وہ عمل خدا کے ہاں قبولیت سے کیوں محروم رہتے ہیں، کام تو اس کے وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ قرار دیئے گئے ہیں؟

جن لوگوں کو یہ بات کھٹکتی ہے وہ دین کی ایک بنیادی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے اچھائی اور بھلائی کے کاموں کا محتاج نہیں ہے کہ جو لوگ بھلائی کا کوئی کام کر دیں۔ خواہ وہ اس کے لیے کریں یا کسی اور کے لیے، خواہ وہ اس عمل کو اس کے حکم کے مطابق کریں یا اس کے خلاف، وہ ان کا ممنون کرم ہو جائے کہ ان لوگوں نے اس پر یا اس کی دنیا پر کوئی احسان کر دیا ہے اس وجہ سے اس پر لازم ہو گیا ہے کہ وہ ان کی بھلائیوں کی قدر کرے اور ان کا بدلہ دے۔

اللہ تعالیٰ کسی کی نیکی اور بدی دونوں سے بالکل بے نیاز ہے۔ وہ اگر چاہے تو اپنی ساری دنیا کو صرف دشمنوں

ہی سے بھر دے، اس کے اندر کوئی برائی کرنے والا سرے سے رہ ہی نہ جائے۔ اسی طرح اگر وہ چاہے تو ہر آدمی کو اتنا نیک بنا دے کہ اس سے کسی شر کا صدور سرے ہو ہی نہیں۔ لیکن اختیار اور قدرت کے باوجود اس نے ایسا نہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو صرف نیکی اور بھلائی ہی مطلوب نہیں ہے بلکہ اصل چیز جو مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ لوگ بھلائی کے کام صرف اس کی رضا کے لیے کریں اور اس کے حکموں کے مطابق کریں۔ اس وجہ سے جو نیکی مذکورہ شرطوں کے ساتھ کی جاتی ہے اس کی تو اس کے ہاں بڑی قدر ہے خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی ہو اور وہ اس کا اجر دیتا ہے لیکن جس نیکی میں کسی اور شائبہ کی ملاوٹ ہو جاتی ہے اس کا اس کے ہاں کوئی اجر نہیں ہے، وہ اس طرح کی نیکی کرنے والوں سے کہتا ہے کہ اس کا اجر اس سے لو جس کے لیے تم نے یہ نیکی کی ہے۔ احادیث میں یہی حقیقت اس طرح واضح کی گئی ہے۔ ایک حدیث قدسی ہے۔

انا اغنی الشرکاء عن الشرک من عمل عملاً اشرک فیہ غیری فھو للذی اشرک بہ وانا منہ بری	میں سارے سے تمام شریکوں سے زیادہ بے نیاز ہوں جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس میں میرے ساتھ اس نے کسی دوسرے کو بھی شریک کر لیا تو وہ عمل اسی کے لیے ہو جاتا ہے جس کو اس نے میرے ساتھ شریک کیا اور میں اس سے بری ہو جاتا ہوں۔

☆

جب آخرت میں ایسے لوگ اجر کے طالب ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ:

اذھب فخذ اجرک ممن عملت لہ لا اجر لک عندنا	جاؤ اس سے تم اپنے عمل کا معاوضہ لو جس کے لیے تم نے یہ کام کیا ہے، ہمارے ہاں تمہارے لیے کوئی اجر نہیں ہے۔

●

یہ شریک، کوئی بت اور صنم بھی ہو سکتا ہے، خاندان اور قبیلہ بھی ہو سکتا ہے، قوم اور وطن بھی ہو سکتے ہیں، شہرت، دکھاوے اور نفس کی دوسری خواہشیں بھی ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے جو چیز بھی ہو وہ اخلاص کی ضد ہے اور وہ انسان کے عمل کو عند اللہ باطل کر دیتی ہے۔

اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ کوئی مخلص مسلمان اپنے خاندان یا قبیلہ یا اپنے قوم اور وطن کے لیے کوئی کام کر ہی نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے خاندان اور قبیلہ قوم اور وطن کے حقوق و فرائض خود نہایت

تفصیل کے ساتھ متعین کر دیئے ہیں اور ہر مسلمان پر یہ واجب کر دیا ہے کہ ہر شخص ان حقوق و فرائض کو اللہ کی رضا کے لیے اور اس کے حکموں کے مطابق ادا کرے، جو شخص ان حقوق و فرائض کو اللہ کی رضا کے لیے اور اس کے احکام کے مطابق ادا کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا بڑا اجر ہے اور اس کا وہ کام عبادت میں شمار ہوتا ہے اگرچہ وہ بیوی کے منہ میں لقمہ ہی ڈالنا کیوں نہ ہو لیکن اگر وہ کام خدا کے لیے نہ ہو تو وہ نری دنیا داری ہے اگرچہ وہ جہاد ہی کیوں نہ ہو۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس اخلاص کے ہونے یا نہ ہونے سے عمل کی فطرت میں بڑا تغیر واقع ہو جاتا ہے۔ فرض کیجیے ایک ماں ہے، ماں کی مامتا بچے کے لیے ہر شبہ سے بالاتر چیز ہے، لیکن اگر وہ اپنی مامتا کے جوش میں یہ کرے کہ بچے کی بیماری میں اس کو وہ سب کچھ کھلانی جائے جس کے لیے بچہ ضد کرے، ڈاکٹر کی ہدایات کی وہ کوئی پروا نہ کرے تو اس مامتا کے باوجود اندیشہ ہے کہ وہ بچے کی جان لے کے رہے گی۔

اسی طرح فرض کیجیے کہ ایک شخص ہے جو کام تو اچھے کرتا ہے لیکن ان کاموں میں اس کے سامنے صرف خدا ہی کی رضا جوئی کا نصب العین نہیں ہے بلکہ خدا کے سوا کوئی اور نصب العین ہے تو لازمی طور پر وہی نصب العین اس کے لیے حق اور باطل پسند اور ناپسند، خیر اور شر کے لیے معیار بن جائے گا۔ آگے چل کر یہ چیز اس کی ہر بھلائی کو برائی کی شکل میں تبدیل کر دے گی۔ وہ اپنے قبیلہ اور اپنی قوم کے لیے اچھے اچھے کام کرتے کرتے بالآخر اس فلسفہ تک پہنچ سکتا ہے کہ "میری قوم، خواہ حق پر ہو، یا باطل پر" یہ فلسفہ بالآخر اس کو ہٹلر اور مسولینی بنا دے سکتا ہے۔ یہ صرف خدا کی رضا جوئی کے نصب العین ہی کا خاصہ ہے کہ وہ انسان کو کبھی بہکنے نہیں دیتا۔ یہ نصب العین انسان کو ایک جہانی اور آفاقی نقطہ نگاہ دیتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کے سامنے ہمیشہ اپنی ذات، اپنی قوم اور اپنے ملک کی بہبود کے ساتھ ساتھ انسانیت کی خدمت کا ایک ہمہ گیر پروگرام رہتا ہے۔

اسی وجہ سے اسلام میں خدا کے سوا کسی اور چیز کو پسند اور ناپسند کا معیار قرار دینا حرام پایا۔ اسی حقیقت کو اخلاص کہتے ہیں۔ یہی اخلاص عقیدہ توحید کی جان اور روح ہے۔ اور یہ عقیدہ (توحید) تعلق باللہ کا بنیادی پتھر ہے۔

مولانا عبدالغفار حسن صاحب

دعاء

(۲)

(۱۰) دعا کے وقت اپنی حاجت وضرورت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرنے سے پہلے حمد وثنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کا اہتمام ضروری ہے۔ دعا سے قبل دو رکعت نفل نماز کی ادائیگی بھی مسنون ہے۔ حدیث میں ہے :-

من کانت لہ حاجۃ الی اللہ تعالیٰ او الی احد من بنی آدم فلیتوضأ ولیحسن وضوئہ ثم لیصل رکعتین ثم لیثن علی اللہ عزوجل ولیصل علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ترمذی ، مستدرک حاکم

جس کسی شخص کو اللہ تعالیٰ یا کسی انسان سے ضرورت وحاجت پورا کرانے کا معاملہ درپیش ہو تو اُسے چاہیے کہ پہلے وضو کرکے دو رکعت نماز پڑھے ، پھر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بجا لائے ، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام بھیجے (اس کے بعد اپنی ضرورت خدا کے حضور عرض کرے۔)

(۱۱) دعا کرتے وقت جزم ویقین کا پہلو غالب ہونا چاہیے یعنی بندے کو یہ اعتماد ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس کی عرض معروض ضرور سنے گا۔

حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

لا یقل احدکم اذا دعا اللّٰھم اغفرلی ان شئت اللّٰھم ارحمنی ان شئت لیعزم المسئلۃ فانہ لا مکرہ لہ

دعا کرتے وقت تم میں سے کسی کو یہ نہیں کہنا چاہیے اے اللہ بخش اگر تو چاہے ، رحم فرما اگر تیری مرضی ہو ، بلکہ سوال کا انداز عزم ویقین لیے ہوئے ہونا

بخاری ، مسلم — چاہیے ، کیونکہ خدا کو مجبور نہیں کیا جاسکتا ۔

ان شئت کہنے میں بظاہر بندے کی طرف سے شانِ بے نیازی کا اظہار بھی ہوجاتا ہے اس لیے اس قسم کے الفاظ سے پرہیز ی ضروری ہے ۔

(۱۲) خدا کی رحمت ونعمت کی طلب خاص اپنے ہی لیے نہ کی جائے ، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک بدو کہہ رہا تھا :

اللھم ارحمنی ومحمداً ولا ترحم معنا احدا	اے اللہ مجھ پر رحم فرما اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ، اور ہمارے علاوہ اور کسی پر رحم نہ فرما ۔

(آپؐ نے یہ سن کر فرمایا) لقد تحجرت واسعًا ۔ تو نے تو خدا کی کشادہ رحمت کو تنگ کردیا ہے (صحیح بخاری)

اسی طرح اگر کوئی شخص امام ہے اور وہ دعا کرتے وقت مقتدیوں کو نظر انداز کرکے محض اپنا ہی خیال رکھتا ہے تو یہ طرزِ عمل بھی خیانت کے ہم معنیٰ ہے ، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے : لا یؤم الرجل فیخص نفسہ ، بالدعاء دونھم فان فعل فقد خانھم (ترمذی)

(۱۳) دعاء میں اپنی ضرورت پیش کرنے سے پہلے اپنے گناہوں کا اقرار واعتراف ضروری ہے جیسا کہ حضرت آدمؑ نے فرمایا تھا رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ ، اسی طرح مسنون دعاؤں میں یہ الفاظ ملتے ہیں ۔ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا کَثِیْرًا یعنی اے رب میں نے اپنی جان پر (تیری نافرمانی کرکے) بہت ہی ظلم کیا ہے ۔

(۱۴) دعا کرتے وقت ہاتھ اٹھانا بھی مسنون ہے ، جیسا کہ حدیث میں ہے آپ نے فرمایا :

ان اللہ حیی کریم یستحیی اذا رفع الرجل یدیہ ان یردھما صفرا خائبتین	اللہ تعالیٰ فضل وکرم اور حیاء وشرم والا ہے جب کوئی اس کی بارگاہ میں دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتا ہے تو اسے خالی ہاتھ واپس لوٹانے میں شرم آتی ہے ۔
ابوداؤد ، ترمذی ، ابن ماجہ	

دعاء کے بعد دونوں ہاتھوں کا چہرے پر پھیر لینا بھی مسنون ہے ۔ (ترمذی ، ابوداؤد)

(۱۵) جب کہ انسان غصہ کی حالت میں ہو یا بول وبراز کی حاجت محسوس کررہا ہو تو ایسے اوقات میں دعا کرتے وقت دلجمعی حاصل نہیں ہوسکتی اسی لیے اس قسم کے حالات سے پاک صاف اور یاکسو ہوکر دعا میں مشغول ہونا چاہیے ۔

(۱۶) دعاء کے وقت آسمان کی طرف نگاہ اٹھانے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے :-

لینتھین اقوام عن رفع ابصارھم الی السماء عند الدعاء او لتخطفن ابصارھم (صحیح مسلم) — لوگ اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھانے سے باز آجائیں ورنہ ان کی نگاہیں اچک لی جائیں گی۔

•

(۱۷) دعائیہ کلمات کو بار بار دہرایا جائے، حدیث میں ہے :-

کان رسول اللہ علیہ وسلم اذا دعا کرر ثلاثا — آپ جب دعا فرماتے تو تین بار دہراتے۔

•

(۱۸) چھوٹی چیز ہو یا بڑی خدا ہی سے مانگے۔ حدیث میں ہے آپ نے فرمایا:

یسئل احدکم ربہ حاجتہ کلھا حتی یسئل شسع نعلہ اذا انقطع (ترمذی) — تم میں سے ہر ایک اپنی تمام حاجتیں اپنے رب ہی سے طلب کرے یہاں تک کہ اگر چپل کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو وہ بھی اسی سے مانگے۔

•

(۱۹) دعاء کے خاتمہ پر آمین کہنا بھی مسنون ہے۔ حدیث میں ہے آپ نے فرمایا :

اوجب ان ختم بآمین — (آپ نے ایک شخص کو دعا کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا) اگر اس نے دعاء کو آمین کے ساتھ ختم کیا تو لازماً اس نے اپنا دعا قبول کروا لیا

•

اوقات دعا یوں تو اللہ تعالیٰ ہر وقت ہر آن اپنے بندوں کی فریاد سنتا اور ان کی دعا قبول فرماتا ہے لیکن کچھ خاص اوقات ایسے ہیں جن میں دعائیں بہت جلد مقبول ہوتی ہیں اور اپنا اثر دکھاتی ہیں :

(۱) سب سے زیادہ اعلیٰ اور مقبول ترین وقت رات کا پچھلا حصہ ہے، اس کے بارے میں قرآن حکیم میں ارشاد ہے :

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْئًا وَّاَقْوَمُ قِيْلًا۔ پ ۲۹ - سورہ مزمل — بلاشبہ رات کا اٹھنا (نفس کو کچلنے اور (رب تعالیٰ سے) گفتگو اور سرگوشی کے لیے بہت ہی زیادہ موزوں ہے۔

ایسے سناٹے کے وقت میں میٹھی نیند اور نرم و گرم بستر چھوڑ کر اپنے رب سے مناجات کے لیے اٹھنا انتہائی سعادت اور خوش نصیبی کی نشانی ہے۔

حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

ینزل ربنا کل لیلۃ الی السماء الدنیا حتیٰ یبقیٰ ثلث اللیل الآخر فیقول من یدعونی فاستجیب لہ، من یسئلنی فاعطیہ، من یستغفرنی فاغفر لہ (بخاری، مسلم)

اللہ تعالیٰ ہر رات آسمانِ دنیا پر نزولِ اجلال فرماتا ہے یہاں تک کہ جب رات کا پچھلا تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے تو فرماتا ہے کون مجھے پکارتا ہے کہ میں اس کی دعا قبول کروں، کون مجھ سے مانگتا ہے کہ میں عطا کروں، کون مجھ سے مغفرت چاہتا ہے کہ میں اُسے معاف کردوں۔ (ترمذی)

(۲) جمعہ کی شب میں بھی ایک ایسی ساعت ہے جس میں دعا قبول ہوتی ہے۔

(۳) جمعہ کے دن میں بھی ایک ساعت ایسی ہے جس میں اللہ تعالیٰ دعا قبول فرماتا ہے، بخاری مسلم۔ بعض روایات میں متعین طور پر عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت بتلایا گیا ہے۔

(۴) شب قدر۔ قرآن و حدیث میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔

(۵) اذان اور (۶) اقامت کے وقت (۷) اور اذان و اقامت کے درمیان دعا قبول ہوتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے:

ثنتان لا ترد ان الدعاء عند النداء وعند البأس (ابوداؤد)

دو چیزیں رد نہیں کی جاتیں، دعا اذان اور جہاد کے وقت۔

(۸) جہاد فی سبیل اللہ میں صف بندی کے وقت دعا قبول ہوتی ہے جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث میں عند البأس کا لفظ آیا ہے۔

(۹) فرض نمازوں کے بعد بھی دعا کی مقبولیت کا وقت ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ امام کے سلام پھیر لینے کے بعد مقتدی دعا کرنے میں امام کی اتباع کریں، اسی طرح سلام پھیرنے کے فوراً بعد بغیر اذکار مسنونہ پڑھے ہاتھ اٹھا کر دعا بھی سنت سے ثابت نہیں ہے۔

(۱۰) سجدے کی حالت میں دعا قبول ہوتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے:—

اقرب ما یکون العبد من ربہ وھو ساجدٌ فاکثروا الدعاء

یعنی سجدے کی حالت میں بندہ اپنے رب سے بہت ہی قریب ہوجاتا ہے تو اسی حالت میں خوب دعا مانگا کرو۔

تلاوت قرآن یا ختم قرآن مجید کے موقع پر دعا قبول ہوتی ہے، حدیث میں ہے :۔

من قرء القرآن فلیسئل اللہ بہ فانہ سیجیء اقوام یقرؤن القرآن لیسئلون بہ الناس (ترمذی)

جو قرآن پڑھے اُسے قرآن کے واسطے سے اپنے رب سے مانگنا چاہیے۔ عنقریب ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو قرآن پڑھ کر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں گے

(۱۲) عرفہ کے دن دعا قبول ہوتی ہے، حدیث میں ہے : خیر الدعاء یوم عرفۃ (ترمذی)

(۱۳) ماہ رمضان میں خصوصاً افطار کے وقت دعا قبول ہوتی ہے۔

حدیث میں ہے، تین قسم کے لوگ ہیں جن کی دعا رد نہیں ہوتی، ان میں سے ایک روزے دار ہے جو افطار کے وقت اپنے رب کے حضور دعا کرتا ہے۔

(۱۴) بارش کے وقت، بارش میں کھڑے ہو کر دعا مانگی جائے تو قبول ہوتی ہے۔

(۱۵) ذکر الٰہی کے لیے مسلمان جمع ہوں تو یہ وقت قبولیت دعا کے لیے سازگار ہے۔ (نزل الابرار)

دعا کے مقامات | یہ مقامات زیادہ تر وہ ہیں جن کا تعلق مناسک حج سے ہے۔

(۱) بیت اللہ شریف یعنی اس کے قریب یا اس کے اندر۔ (۲) مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، (۳) بیت المقدس۔ (۴) رکن اور مقام ابراہیم کے درمیان مُلتزَم پر دعا قبول ہوتی ہے (طبرانی) (۵) صفا، مروہ پر۔ (۶) جہاں سعی کی جاتی ہے۔ (۷) میدان عرفات میں۔ (۸) مزدلفہ میں (۹) تینوں جمرات کے پاس (۱۰) منیٰ میں (۱۱) میزاب کے نیچے۔ (۱۲) مقام ابراہیم کے پیچھے۔

مندرجہ ذیل افراد کی اللہ تعالیٰ دعا قبول فرماتا ہے :

مستجاب الدعوات افراد | (۱) مظلوم مُضطر، یعنی مظلوم اور بے قرار پریشان حال بندے کی اللہ تعالیٰ دعا قبول فرماتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے :

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ

کیا ہے کوئی دے قرار کی فریاد سنے جب کہ وہ اسے پکارے اور ہے کوئی جو اس کی تکلیف کو دور کرے

یعنی یہ خصوصیت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔

(۲) باپ کی دعا بیٹے کے بارے میں۔ (۳) مسافر، حدیث میں ہے ثلاثۃ یستجاب، الوالد المسافر، المظلوم (ترمذی)

(۴) نیک اولاد کی دعا ماں باپ کے حق میں (بزار) (۵) روزے دار۔
(۶) انصاف پسند حاکم کی دعا (ابن حبان، ابن خزیمہ) (۷) مسلمان کی دعا اپنے غیر حاضر مسلمان بھائی کے حق میں (ترمذی) (۸) گناہ سے توبہ کرنے والے کی دعا۔ (۹) آیت کریمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ پڑھنے کے بعد دعا قبول ہوتی ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے:۔

لم یدع بھا رجل مسلم فی شئی قط الا استجیب لہ — یہ آیت کریمہ جو مسلمان بھی پڑھے گا اس کی دعا قبول ہوگی۔

(۹) حاجی جب تک سفر میں ہوتا ہے، اس کی دعا قبول ہوتی ہے (حصن حصین)
(۱۰) رات کو جاگنے والا اگر لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، لہ الملک ولہ الحمد وھو علیٰ کل شئی قدیر پڑھ کر دعا کرے تو اس کی دعا قبول ہوگی۔ (بخاری، ترمذی)

دعا کے اثرات و ثمرات دعا اگر بارگاہ الٰہی میں قبول ہو جائے تو اس سے بڑھ کر سعادت اور خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے، یہ تو بڑا ہی اعلیٰ مقام ہے۔ دعا بظاہر اگر قبول بھی نہ ہو تب بھی اپنے رب سے اس بہانے مناجات اور سرگوشی کی جو نعمت حاصل ہو جاتی ہے وہ کیا کچھ کم سعادت ہے۔ پھر اس دعا کے نتیجے میں مومن بندے کو تسکین روح اور اطمینان قلب کی جو دولت حاصل ہوتی ہے اس کی برکتوں کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:۔

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب — سنو! اللہ تعالیٰ کے ذکر ہی سے دل اطمینان و سکون سے ہم کنار رہتے ہیں۔

یہ وہ دولت ہے جس کے لیے بھرپور خزانوں والے سرمایہ دار اور وسیع اختیارات رکھنے والے ارباب اقتدار بھی ترستے ہیں لیکن یہ نعمت ملتی اسی کو ہے جو ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دولت سے مالا مال ہو۔ اللھم اجعلنا منھم

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

☆

مراسلہ و مذاکرہ

- دنیا میں ناقص چیزوں کے وجود کی مصلحت
- شیعہ حضرات اور اکابر صحابہؓ
- امام بخاریؒ کی مستند سوانح حیات
- حضرت عائشہؓ سے کمسنی میں نکاح کی مصلحت
- آیات متشابہات

(۳)

۵ - دنیا میں ناقص چیزوں کے وجود سے متعلق مجھے سب سے زیادہ صحیح جواب وہ معلوم ہوتا ہے جو سیدنا مسیح علیہ السلام نے اپنے ایک شاگرد کو دیا تھا۔ شاگرد نے حضرت مسیح علیہ السلام سے پوچھا تھا کہ اے استاذ، دنیا میں یہ مادرزاد اندھے کیوں پائے جاتے ہیں، آخر انھوں نے پیدا ہونے سے پہلے کیا گناہ کیا جس کی ان کو یہ سزا ملی ہے؟ حضرت مسیح علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ یہ مادرزاد اندھے اس لیے پیدا کیے گئے ہیں تاکہ آنکھ والوں کو بصیرت حاصل ہو۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے اس جواب سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ دنیا میں اگر اندھے، لنگڑے، اپاہج، کوڑھی، مفتور العقل پائے جاتے ہیں تو اس کی وجہ نہ تو قدرت کی مشین کی کوئی خرابی ہے اور نہ یہ ہے کہ انھوں نے کچھ جرائم کیے تھے جن کی سزا میں وہ ناقص پیدا

کیے گئے ہیں۔ بلکہ ان کے وجود سے مقصود اہل دنیا کے لیے درس عبرت مہیا کرنا ہے۔ اس دنیا کو اس کے خالق نے اس کے وجود ہی میں ایک بہترین درسگاہ کی شکل میں ترتیب دیا ہے جس میں انسان کی آنکھیں کھولنے، اس کے دل کو بیدار رکھنے اور اس کی عقل کو رہنمائی دینے کے لیے قدم قدم پر اسباب وسامان موجود ہیں۔ انسان خدا شناسی اور حقیقت رسی کے لیے جن چیزوں کا محتاج ہے وہ ساری چیزیں اس گھر کے اندر ہی جمع کر دی گئی ہیں۔ اس کی ایک ایک اینٹ پر حقیقت کا کوئی نہ کوئی نقش کندہ ہے۔ بلکہ عارفوں کے الفاظ میں اگر میں بات کہوں تو یوں بھی کہہ سکتا ہوں کہ اس چمن کا ہر پتہ معرفت کردگار کا ایک دفتر ہے۔

انسان کا حال آپ دیکھتے ہیں کہ اس کو جو چیز ملی ہوئی ہے وہ سمجھتا ہے کہ یہ تو اس کو ملنی ہی تھی۔ وہ آنکھ کو، کان کو، ہاتھ کو، پاؤں کو، عقل کو، صحت کو، غرض ہر چیز کو اپنا حق، اپنی ملکیت، اور اپنی جائداد سمجھنے لگتا ہے اور اس حماقت میں مبتلا ہو کر بالکل فرعون بن بیٹھتا ہے۔ جن نعمتوں کو پاکر اسے اپنے خالق و مالک کا شکر گذار بننا تھا ان کے گھمنڈ میں وہ اتراتا اور اکڑتا ہے، جن قوتوں اور صلاحیتوں سے متمتع کیے جانے کے سبب سے اسے اپنے رب کی بندگی اور اطاعت میں سرگرم ہونا تھا ان کو وہ اپنے رب ہی کی نافرمانی اور اسی کے خلاف بغاوت میں استعمال کرتا ہے۔ ایسے اندھوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے قدرت نے یہ انتظام کیا ہے کہ اس نے مادرزاد اندھے بھی پیدا کر دیے ہیں تاکہ اگر وہ دیکھنا چاہیں تو دیکھ سکیں کہ خدا چاہتا تو انھیں بھی اسی حالت میں وہ پیدا کر سکتا تھا لیکن یہ محض اس کا فضل و احسان ہے کہ اس نے ان کو آنکھوں والا بنایا۔ اسی طرح مذکورہ بالا قسم کے سائنس زدہ پاگلوں کو سبق دینے کے لیے قدرت نے بہت سے پاگل اور دیوانے بھی بنا چھوڑے ہیں تاکہ اگر یہ چاہیں تو یہ سبق حاصل کر سکیں کہ قدرت کے کارخانے میں یہ نمونے ڈھالنے والے سانچے بھی موجود تھے لیکن یہ محض اس کا احسان ہے کہ ان کو اس نے عقل کی نعمت سے نوازا۔

غور کیجیے کہ یہ کتنی عظیم تعلیم ہے جو دنیا کی یہ ناقص چیزیں ان لوگوں کے لیے فراہم کر رہی ہیں جو ہر قسم کے خلقی نقص سے پاک ہیں۔ یہ ناقص چیزیں ایک طرف تو ہمیں اس بات کا سبق دیتی ہیں کہ قدرت کی یہ عظیم نعمتیں ہمیں بغیر کسی استحقاق کے محض اس کے فضل سے ملی ہوئی ہیں۔ اگر یہ نہ ملتیں

تو کوئی نہیں تھا جو ہمیں یہ نعمتیں دے سکتا، ہمارا حال بھی آج یہ ہوتا کہ ہم سڑکوں کے کنارے بیٹھے ہوئے ہر گذرنے والے کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہوتے۔ دوسری طرف یہ اس بات کا سبق دیتی ہیں کہ اہل نعمت کی نعمتوں کا حق یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کے کام آئیں جو ان نعمتوں سے محروم ہیں۔

آدمی اگر دنیا کی ناقص المخلقت چیزوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھے تو اسے ہر چیز زبان حال سے یہ کہتی ہوئی سنائی دے گی۔

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش حقیقت نیوش ہو

لیکن افسوس یہ ہے کہ آنکھیں رکھنے والوں میں عبرت نگاہی کا فقدان ہے اور کان رکھنے والے حقیقت نیوشی سے محروم ہیں۔

ممکن ہے گفتگو کے اس موقع پر آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ قدرت نے ایک کو سبق دینے کے لیے دوسرے کو کیوں مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ اس سوال کے جواب میں، میں یہ عرض کروں گا کہ یہ کیوں کے بعد کیوں کا سلسلہ اگر شروع ہو گیا تو یہ سلسلہ لامتناہی ہو جائے گا۔ اس کائنات کے بنانے والے نے یہی پسند فرمایا ہے کہ اس میں ایک کو دوسرے سے آزمائے۔ کذالک فتنا بعضھم ببعض۔ اس نے ایک کو غریب دوسرے کو تونگر، ایک کو کمزور، دوسرے کو قوی، ایک کو بینا اور دوسرے کو نابینا بنا کر دونوں کا امتحان کیا ہے اور یہ دیکھنا چاہا ہے کہ بینا، بینا ہو کر نابینا کے ساتھ کیسا معاملہ کرتا ہے اور ایک نابینا، نابینا ہو کر اپنے رب کا کیسا وفادار بندہ رہتا ہے۔

میں اس سلسلہ میں جو بات عرض کر سکتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بندے کو اگر اپنی کسی نعمت سے محروم رکھا ہے تو اس نعمت کی ذمہ داریوں اور مسئولیتوں سے بھی اس کو بری رکھا ہے۔ اب یہ راز اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں کھلے گا کہ خوش قسمت وہ ہے جس نے آنکھیں پائیں لیکن ان کا حق ادا نہیں کیا، یا وہ خوش قسمت ہے جس کو نہ آنکھیں ملیں نہ ان کے حق کے بارے میں اس سے سوال ہوا۔

علیٰ ہذا القیاس یہ راز بھی آخرت ہی میں کھلے گا کہ جنھوں نے ملی ہوئی نعمتوں کا حق ادا کیا ہے،

ان کو اللہ تعالیٰ اپنی ان نعمتوں کا کیا معاوضہ دنیا ہے جن سے اس نے اس دنیا میں ان کو محروم رکھا۔ میں تو اجمالی طور پر صرف یہ ایمان رکھتا ہوں کہ جو لوگ آنکھیں پاکر دنیا میں اندھے بنے رہے آخرت میں ان کے مقابل میں شاید وہ لوگ اچھے رہیں جو آنکھوں سے محروم رہے۔ اسی طرح اس بات پر بھی ایمان رکھتا ہوں کہ جنھوں نے ملی ہوئی نعمتوں کا دنیا میں حق ادا کیا ہوگا وہ نہ ملی ہوئی نعمتوں کا آخرت میں انشاء اللہ وہ صلہ پائیں گے کہ نہال ہوجائیں گے۔

رہا آپ کا یہ سوال کہ اس دنیا میں شر کا وجود کیوں ہے تو اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ اس دنیا میں شر محض کا وجود سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہاں شر جو کچھ پایا جاتا ہے اس کی حیثیت شر محض کی نہیں ہے بلکہ وہ کسی خیر سے ضمناً پیدا ہوجاتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار کا شرف عطا فرمایا ہے جو ایک عظیم خیر ہے لیکن انسان اس خیر کو غلط استعمال کرکے اس سے بہت سے شر پیدا کرلیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کے پیدا کیے ہوئے بہت سے شرور کو اس دنیا میں جینے یا غالب ہونے کا موقع اگر دے دیتا ہے تو یہ بھی اس وجہ سے نہیں کہ شر سے اس کو کوئی محبت ہے بلکہ یا تو اس وجہ سے دے دیتا ہے کہ اس نے ازل سے یہ قانون بنا رکھا ہے کہ وہ باطل کو بھی اتنی مہلت دے گا جتنی مہلت میں وہ اپنا پیمانہ بھرلے اور خدا کے سامنے پیش کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے یا اس وجہ سے دیتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے وہ کسی خیر کی تربیت کرنا یا اس کو نشوونما دینا چاہتا ہے۔

میں نے شر محض کا جو لفظ استعمال کیا ہے اس کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ سب سے بڑا شر جس کو آپ شر محض قرار دے سکتے ہیں وہ تو شیطان ہے لیکن شیطان کیا چیز ہے؟ جنوں اور انسانوں کے اندر کے وہ افراد جو خود گمراہ ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں وہی شیطان ہیں۔ اب غور کیجیے کہ جنات و انسان بجائے خود تو شر نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے تو ان کو نہایت اچھی صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے لیکن یہ خود اپنے ارادہ سے ابلیس کے نقش قدم کی پیروی کرکے گمراہ ہوتے ہیں اور پھر اس کی امت میں شامل ہوکر دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔

۶۔ یہ سوال ہم سے پوچھنے کا نہیں ہے بلکہ خود شیعہ حضرات سے پوچھنے کا ہے۔ ہمارے نزدیک تو ساری خرابی کی بنیاد ان حضرات کا غلو ہے۔ اہل بیت کی محبت کی ایک حد تو وہ شرعی حد ہے جو مقتضائے ایمان و اسلام ہے جس سے کسی مسلمان کے لیے بھی انکار کی گنجائش نہیں ہے اور ایک حد

وہ ہے جو ان حضرات نے خود قائم کی ہے۔ انھوں نے اہل بیت کی محبت کے یہ معنی لیے ہیں کہ سارے دین کو انہی پر منحصر قرار دے دیا ہے۔ اور جو کچھ ان کے مخصوص ذرائع سے منقول ہے اس کے سوا یہ لوگ کسی چیز کو بھی کوئی وزن نہیں دیتے۔

آپ کو جو اس بات پر تعجب ہے کہ "آخر واضح احادیث کی موجودگی میں وہ کیونکر اپنی ہٹ پر قائم رہ سکتے ہیں؟" تو آپ کو یہ تعجب غالباً اس غلط فہمی کے سبب سے ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ حدیث کی جن کتابوں کو آپ مستند و معتبر مانتے ہیں یہ حضرات بھی ان کو مستند و معتبر مانتے ہیں۔ اگر آپ اپنے ذہن میں یہ خیال رکھتے ہیں تو اس خیال کو ذہن سے نکال دیجیے۔ ان حضرات کے حدیث و فقہ ہر چیز کے اپنے مجموعے ہیں جو ان کے اپنے خاص ذرائع سے نقل ہوئے ہیں۔ یہ انہی کو مستند و معتبر مانتے ہیں۔ ان مجموعہائے احادیث کو یہ کوئی وزن نہیں دیتے جو ہمارے ہاں معتبر ہیں۔

۷۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں اردو میں سب سے زیادہ جامع اور مفصل کتاب غالباً مولانا عبدالسلام صاحب مبارک پوری مرحوم کی سیرۃ البخاری ہے۔ یہ کتاب ہم نے اگرچہ زمانہ طالب علمی میں پڑھی ہے اس وجہ سے اب کچھ زیادہ باتیں اس کی ذہن میں نہیں ہیں لیکن اتنی بات یاد ہے کہ ہمیں بھی یہ کتاب پسند آئی تھی اور دوسرے اہل علم بھی اس کی تعریف کرتے تھے۔

لیکن آپ کی تلاش اگر "ہر شبہ سے بالا ذریعہ معلومات" کے لیے ہے تو میں اس کتاب کو یہ درجہ نہیں دے سکتا۔ اس کے متعلق تو میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اچھی کتاب ہے مستند حوالوں اور تحقیق و محنت سے لکھی گئی ہے۔ اور ہمارے نزدیک کسی کتاب کے اچھے ہونے کے لیے اس کے اندر ان اوصاف کا پایا جانا کافی ہے۔ ہر شبہ سے بالا کتاب تو قرآن مجید کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔

اردو میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں مذکورہ بالا کتاب کے سوا ہم نے کوئی اور کتاب نہیں پڑھی ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی اور کتاب بھی ہو جو ہماری نظر سے نہ گذری ہو۔ دوسرے اہل علم نے اگر کسی کتاب کا پتہ دیا تو ہم اس کا نام بھی ان صفحات میں شائع کر دیں گے۔

امام بخاریؒ رحمۃ اللہ علیہ کے تمام علم و فن کا اصلی خزانہ درحقیقت ان کی صحیح بخاری ہے جو مسلم طور پر فن حدیث کی سب سے زیادہ قابل اعتماد کتاب ہے۔ اسی کتاب کے مطالعہ سے امام بخاریؒ کے علم و تفقہ کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے لیکن یہ کتاب اپنے اندر بڑی ہی نازک فنی مشکلات رکھتی ہے اس وجہ سے

ہر شخص کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا آسان نہیں ہے۔ صرف وہی لوگ اس سے کماحقہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو بخاری کی خصوصیات سے اچھی طرح واقف ہوں۔

۸۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نکاح کیے ان پر عام نکتہ چینیوں کے نقطہ نظر سے غور کرنا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ حضورؐ نے جتنے نکاح بھی کیے ہیں سورہ احزاب اور سورۂ تحریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انتخاب سے کیے ہیں اور ان میں شادی بیاہ کے عام مقصد سے زیادہ دین اور ملت کی مصلحتوں کو دخل رہا ہے۔ آپ کی ساری زندگی اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت کے لیے تھی اور اس دعوت کا تعلق جس طرح مردوں سے تھا اسی طرح عورتوں سے بھی تھا۔ عورتیں اس دعوت کی مخاطب صرف ضمنی ہی طور پر نہیں تھیں بلکہ مردوں ہی کے برابر برابر تھیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کے لیے اعلیٰ اوصاف اور صلاحیتوں کی بیویاں خود ہی منتخب فرمائیں اور ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ وہ دنیوی اغراض و مقاصد سے بالاتر رہتے ہوئے اس کتاب و حکمت کی تعلیم پھیلائیں جن کی تعلیم خود ان کو مل رہی ہے۔

چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں کے معاملہ پر غور کرنے سے دو پہلو نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔ ایک تبلیغ دین کا نصب العین۔ دوسرے اسلام کے خدمت گذار خاندانوں کے ساتھ رشتہ داری۔ یہ دوسرا پہلو بھی محض ظاہر میں دوسرا پہلو ہے ورنہ ہے حقیقت میں یہ پہلے ہی کا جزو۔

اب خاص حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کے مسئلہ کو لیجیے تو چند باتیں بالکل واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ صدیق اکبرؓ کے خاندان کو اسلام کی خدمت کے لحاظ سے جو بلند مقام حاصل تھا وہ کسی خاندان کو بھی حاصل نہ تھا۔ قدرتی طور پر حضورؐ کو بھی اس خاندان کی تالیف و تشریف مدنظر رہی ہوگی۔ اور حضرت صدیق اکبرؓ کے دل میں بھی یہ تمنا ہوگی کہ حضورؐ کے ساتھ روحانی نسبت کے ساتھ ساتھ کوئی مادی نسبت بھی حاصل ہو جائے۔ اس تمنا کا حقیقی اندازہ ہمیں اور آپ کو صحیح طور پر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ آدمی حالات کو اس نگاہ سے دیکھ سکے جس نگاہ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ دیکھتے تھے۔ آپ کو تو اسی بات پر تعجب ہے کہ اس کم عمری میں حضرت ابوبکرؓ نے کس طرح بیٹی بیاہ دی لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ کے لیے تو بیٹی کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت پا جانا ہی اتنی بڑی چیز تھی جس سے بڑی کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی تھی۔ علیٰ ہذا القیاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر اس راہ سے اپنے

اور اسلام کے سب سے بڑے جاں نثار خاندان کی دلداری فرما سکتے تھے تو حضورؐ کی قدردانی سے یہ بات بعید تھی کہ حضورؐ اس کے لیے خود پیش قدمی نہ فرمائیں۔

نتائج کے پہلو سے اگر اس رشتہ کی برکتوں پر غور کیجیے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس رشتہ کا انتخاب اللہ تعالیٰ ہی نے فرمایا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم جس مقدار میں اور جس وضاحت کے ساتھ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ذریعہ سے دنیا میں پھیلا ہے، عورتوں میں تو کیا مردوں میں بھی مشکل ہی سے چند آدمی ان کے اس وصف امتیازی میں ان کے ہمسر قرار پا سکتے ہیں۔ اسلامی شریعت کا جو حصہ خاص عورتوں سے متعلق ہے اس کا تو وہ سب سے بڑا ذریعہ ہیں ہی، مردوں سے متعلق بھی اسلامی شریعت کا ایک بہت بڑا حصہ انہی کے نقل و روایت کا رہین احسان ہے۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ صرف نقل و روایت ہی نہیں کرتی ہیں بلکہ تفقہ اور اجتہاد کے اعتبار سے بھی ان کا مرتبہ بہت اونچا ہے۔ اسلامی شریعت کے اسرار و رموز سمجھنے میں جس تہہ تک ان کی نگاہ پہنچتی ہے، وہاں تک بہت تھوڑے لوگوں کی نگاہ پہنچتی ہے۔

ایک تیسرا پہلو یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ ان کی اس کم عمری میں نکاح کر کے حضورؐ نے ہمارے سامنے اپنی حیات طیبہ کا ایک ایسا صفحہ پیش کیا ہے جو صرف اسی شکل میں ہمارے سامنے آسکتا تھا۔ اس کے بغیر یہ ہمارے سامنے نہیں آسکتا تھا۔

کم سنی کی شادی اسلام میں کوئی پسندیدہ چیز نہیں ہے لیکن کبھی کبھی دینی، اخلاقی یا خاندانی و اجتماعی مصلحت کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ کوئی شادی کم سنی ہی میں ہو جائے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طرز عمل دینی و اجتماعی مصالح کے نقطہ نظر سے اس کے جواز کو ثابت کرتا ہے۔ لیکن اس صورت میں ایک قوام پر جو ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں وہ بڑی اہم ہیں اور ان ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا کرنے کا طریقہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ جب شوہر کے گھر تشریف لائی ہیں تو زندگی کے تجربات سے وہ بالکل ناآشنا تھیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تجربات کے حاصل کرنے میں حضرت عائشہؓ کی ہر قدم پر مدد اور رہنمائی فرمائی لیکن اس رہنمائی میں کسی ایک جگہ بھی شوہرانہ تحکم کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی بلکہ ہر جگہ اس کے اندر ماں، باپ اور بھائی بہن کی شفقتوں سے بھی زیادہ گہری شفقت کی حلاوت نظر آتی ہے۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ساتھ کم عمری میں نکاح نہ کیا ہوتا

تو حضورؐ کی زندگی کا یہ دلکش پہلو ہمارے سامنے کس طرح آتا؟

۹۔ آیات متشابہات سے مراد قرآن مجید کی وہ آیات ہیں جن میں جنت و دوزخ اور احوال غیب کی وہ تفصیلات بیان ہوئی ہیں جن کے سمجھنے کے لیے تمثیل و تشبیہ کے سوا اور کوئی طریقہ ہی نہیں ہے۔ جہاں تک آخرت کا تعلق ہے اس کو اصولاً سمجھ لینا تو عقلاً ممکن ہے لیکن آخرت کے عذاب و ثواب کی تفصیلات اور لوح، قلم، کرسی، عرش، میزان وغیرہ جیسے حقائق کو سمجھانے کے لیے اس کے سوا اور کیا راستہ ہے کہ ہماری زبان کی تعبیریں ان حقائق کی تفہیم کے لیے استعمال کی جائیں۔ لیکن یہ تعبیرات بہرحال تمثیل و تشبیہ کی نوعیت کی چیزیں ہیں جن سے ان کا ایک تصور تو ہمارے سامنے آسکتا ہے لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ بعینہٖ یہ حقائق ہمارے سامنے آگئے ہیں۔

ان حقائق کے متعلق یہ کہنا کہ چونکہ یہ ہمارے سمجھ و احساس سے بالا ہیں اس وجہ سے ان کے بیان کا سرے سے کوئی فائدہ ہی نہیں ہے کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ اس میں تو شبہ نہیں کہ اس بیان سے ان حقائق کی حقیقت ہماری سمجھ میں نہیں آسکتی لیکن ان کا ایک تصور ہمارے سامنے آتا ہے جس سے ہمارے علم میں بھی بڑا اضافہ ہوتا ہے اور ان کے اخلاقی اثرات بھی ہماری زندگیوں پر مترتب ہوتے ہیں بشرطیکہ ہم ان پر اسی اجمال کے ساتھ ایمان لائیں جس اجمال کے ساتھ وہ بیان ہوئے ہیں۔ ان میں کوئی ٹیڑھ پیدا کرنے اور ان کی آڑ لے کر کوئی فتنہ اٹھانے کی کوشش نہ کریں۔ چنانچہ جن لوگوں کے علم میں پختگی ہوتی ہے وہ اس طرح کی چیزوں کی زیادہ کھوج کرید میں نہیں پڑتے بلکہ ان پر اجمالاً ایمان لاتے ہیں اور ان کی تفصیلات و کیفیات کے علم کو علم الٰہی کے حوالہ کرتے ہیں۔ امام مالکؒ کے متعلق آپ نے شاید سنا ہو کہ ان سے پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر استوا کی کیا حقیقت ہے تو انھوں نے جواب میں فرمایا کہ استواء معلوم ہے لیکن اس کی کیفیت مجہول ہے۔

اسی پر ان ساری باتوں کو قیاس کر لیجیے جو احوال غیب اور احوال آخرت سے متعلق قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں۔ ان کی اصل کیفیات ہم یہاں بلاشبہ نہیں سمجھ سکتے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہمارے لیے ان کا تصور بھی بالکل غیر مفید ہے۔ ایک دیہاتی کے لیے ایک نادیدہ شہر کے عجائب و غرائب کی تفصیلات اس اعتبار سے اس کے علم سے مافوق ہی ہوتی ہیں کہ وہ اپنے پیمانوں سے ان میں سے کسی چیز کو بھی نہ ناپ سکتا ہے نہ تول سکتا ہے لیکن یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ تفصیلات اس کے لیے بالکل ہی بے سود ہوتی ہیں۔

اسی پر قیاس غیب کے حالات و معاملات کو کیجیے، ان کے بیان کے لیے ہماری زبان ناقص ہے اور ان کے احاطہ کے لیے ہماری عقل محدود لیکن اگر ایک چیز کا ہم احاطہ نہیں کر سکتے تو اس کے یہ معنی کب ہیں کہ اس کا ہم سرے سے کوئی تصور ہی نہیں کر سکتے۔ تصور کر سکتے ہیں اور یہ تصور ہمارے علم میں بھی اضافہ کر سکتا ہے اور اگر ہم اس کی قدر کریں تو جیسا کہ ہم نے عرض کیا اس سے ہمارے اخلاق کی بھی تربیت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اہل ایمان کے متعلق قرآن مجید میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ جب جنت کی نعمتیں آخرت میں ان کے سامنے آئیں گی تو وہ خوش ہو کر کہیں گے کہ یہ تو وہی چیزیں ہیں جو ہمیں پہلے عطا ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ پہلے انہی آیات کے پردے میں ملی تھیں جن کو قرآن میں متشابہات سے تعبیر کیا گیا ہے۔

متشابہات کے لفظ سے کہیں آپ اس شبہ میں نہ مبتلا ہوں کہ اس سے مراد شبہ میں ڈال دینے والی آیات ہیں۔ قرآن میں کوئی چیز بھی شبہ میں ڈالنے والی نہیں ہے۔ متشابہات سے مراد پردہ غیب کی وہی تفصیلات ہیں جن کے بیان کے لیے اس عالم کا تشبیہی جامہ مستعار لیا گیا ہے۔ ایک تو عقائد، اعمال، اخلاق اور موعظت کے اصول اور کلیات ہیں۔ ان کو قرآن نے محکمات سے تعبیر کیا ہے اور سارا دین انہی پر مبنی ہے۔ دوسرے احوال آخرت کی نادیدہ تفصیلات ہیں جو ہمارے عقل کے احاطہ سے تو باہر ہیں لیکن عقل سلیم ان کے قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتی۔ محکمات پر ایمان رکھنے والے ان متشابہات سے بڑا فائدہ اٹھاتے ہیں، انھیں کبھی ان کے سبب سے کوئی تشویش لاحق نہیں ہوتی۔ البتہ جو لوگ سرے سے محکمات ہی کے معاملہ میں بے یقینی میں مبتلا ہوتے ہیں وہ ان متشابہات کی آڑ لے کر سارے دین کے خلاف فتنے اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اطلاع

المکتبۃ الرحمانیۃ اچھرہ لاہور سے منتقل ہو کر 12.A شاہ عالم مارکیٹ لاہور میں آ گیا ہے۔ آیندہ خط و کتابت نئے پتے پر کی جائے

(مینجر)

تقریظ و تنقید

"تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی"

تالیف : مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۔ صفحات ۱۵۲ ۔ کتابت وطباعت اور کاغذ عمدہ ۔ جلد اور گرد پوش خوشنما ۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے ۔ ملنے کا پتہ : مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

یہ کتاب چودھویں صدی ہجری کے مشہور و مقبول بزرگ حضرت مولانا فضل رحمان گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات، حالات و کمالات، اور ارشادات و ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ اس کے مرتب کرنے والے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہیں۔ فاضل مصنف نے اس کتاب میں وہ سارا مواد نہایت عمدہ ترتیب کے ساتھ یکجا کر دیا ہے جو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مختلف تذکرہ نویسوں کے تذکروں میں منتشر تھا۔ یہ حالات نہایت موثر اور زندگی بخش ہیں۔ ان کو پڑھ کر طبیعت یقین و اعتماد کی لذت سے سرشار ہو جاتی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ جس کے حالات زندگی سن کر اور پڑھ کر دل پر یہ حالت طاری ہوتی ہے، اس کی صحبت میں بیٹھنے والے اس کے روحانی فیوض سے کس درجہ متاثر ہوتے رہے ہوں گے۔

یہ تذکرہ ہمارے نزدیک مجموعی حیثیت سے بہت مفید ہے۔ انشاء اللہ اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔ لیکن اس کی بعض باتیں موجودہ زمانے کے لوگوں کو کھٹکیں گی۔ ہم اجمال کے ساتھ ان کی طرف بھی اشارہ کیے دیتے ہیں۔

اس میں جگہ جگہ نو وارد معتقدین و مسترشدین کے ساتھ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا جو طرز عمل بیان ہوا ہے وہ طبیعت میں ایک الجھن پیدا کرتا ہے۔ یہ طرز عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی تعلیم کے بھی خلاف نظر آتا ہے اور عملی تربیت کے بھی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کا طریقہ بھی اس کے خلاف رہا ہے۔ اگر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا یہ طرز عمل سنت کے مطابق ہے تو فاضل مصنف کو اس کی وضاحت کرنی تھی اور اگر سنت کے خلاف ہے تو صاف صاف یہ لکھنا تھا کہ یہ چیز صحیح

نہیں ہے۔ جو لوگ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ہر چیز کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھیں گے (اور ظاہر ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والوں کی اکثریت ایسے ہی لوگوں پر مشتمل ہوگی) اگر وہ مولانا کے اس طرز عمل کو بھی صحیح سمجھ بیٹھیں اور اس کی تقلید شروع کر دیں تو ہمیشہ اندیشہ ہے کہ وہ بڑے سخت فتنہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اس میں جگہ جگہ کشوف و کرامات کا جو ذکر آیا ہے وہ کچھ اچھے طریقہ سے نہیں آیا ہے۔ اس کو پڑھ کر پڑھنے والے کے دل پر یہ اثر پڑتا ہے کہ آدمی کے خدا رسیدہ ہونے کے لیے یہ انداز کچھ ضروری سا ہے کہ وہ بے دھڑک جس کی قبر کو چاہے تاریک اور جس کی قبر کو چاہے روشن بتا دے۔ اور جب اولاد کا کوئی متمنی اس کی خدمت میں اولاد کی تمنا لے کر جائے تو وہ اس کے سامنے اپنا "بدھنا" الٹ دے اور وہ اس کے جتنے بیر اور جتنے بتاشے کھائے وہ اس کو اتنی ہی لڑکوں اور لڑکیوں کی ولادت کی بشارت سنا دے۔ ہم کشوف و کرامات کے منکر نہیں ہیں لیکن ہمارے نزدیک خدا رسیدگی کا وہی معیار صحیح ہے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی پیش کرتی ہے۔

تیسری چیز جو خاص طور پر ہمیں کھٹکی ہے وہ یہ ہے کہ بعض آیات کی تاویل میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا قول صریحاً غلط ہے لیکن فاضل مصنف نے وہ اقوال بھی بغیر کسی تنقید کے اس کتاب میں نقل کر دیے ہیں۔ فاضل مصنف سے زیادہ ان اقوال کی غلطی کس پر واضح ہو سکتی ہے۔ بہتر تو یہ تھا کہ اس قسم کی چیزیں کتاب میں نقل ہی نہ ہوتیں۔ اور اگر ان کا نقل ہونا ضروری تھا تو پھر ان پر تنقید بھی ضروری تھی۔ اس لیے کہ جس طرح عقیدت اپنا ایک حق رکھتی ہے اس طرح علم بھی اپنا ایک حق رکھتا ہے اور ہمارے فاضل دوست ان لوگوں میں سے ہیں جن پر خوش قسمتی سے دونوں کے حقوق عائد ہوتے ہیں اور انھیں دونوں کے حقوق ادا بھی کرنے ہیں۔

اسی قسم کی بعض اور چیزیں بھی کتاب کے مطالعہ کے وقت ہمیں کھٹکی تھیں لیکن ہمارا مقصود یہاں صرف قابل توجہ چیزوں کی طرف اشارہ ہے نہ کہ ان کا استقصاء لیکن ان خامیوں کے باوجود کتاب اپنے اثرات کے لحاظ سے، جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں نہایت مفید ہے۔ ہمیں یہ کتاب رمضان شریف کے آخری عشرہ میں ملی تھی اور ہم نے اس کے مطالعہ میں نہایت گہری روحانی لذت محسوس کی تھی اور

اب بھی مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے بعض واقعات جب یاد آجاتے ہیں تو دل میں ایمان کی حرارت محسوس ہونے لگتی ہے۔ درحقیقت زندہ یہی لوگ تھے جن کے حالات ان کی موت کے بعد بھی روح کو گرماتے اور دل کو تڑپاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا ابوالحسن علی کو ہمت دے کہ وہ ایسی ایسی بہت سی کتابیں لکھ ڈالیں۔

"مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں"

یہ شبلی کالج میگزین (اعظم گڑھ، بھارت) کا ایک خاص نمبر ہے، جو ملک کے مشہور مصنف مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کی یاد میں نکلا ہے۔ یہ کام درحقیقت کرنے کا تو معزز معاصر معارف (اعظم گڑھ) کے تھا اس لیے کہ مولانا مرحوم نے ساری زندگی دارالمصنفین ہی میں گذاری اور جو کچھ لکھا دارالمصنفین اور معارف ہی کے لیے لکھا لیکن غنیمت ہے کہ شبلی کالج کے میگزین نے ان کا حق پہچانا اور ان کی یاد میں یہ دو آنسو بہا لئے۔

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم ہمارے مخدوموں اور بزرگوں میں تھے لیکن ان کو دیکھ کر ہمیں ہمیشہ ان پر رحم ہی آیا۔ ایک طرف تو وہ اپنے اندر کتابیں تصنیف کرنے کی بڑی ہی حیرت انگیز قابلیت رکھتے تھے جس کی شہادت ان کی متعدد بلند پایہ تصنیفات سے ملتی ہے لیکن دوسری طرف ان کا حال یہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہر شخص کے لیے بس ایک دلچسپی کا سامان بنے رہے۔ مرحوم کی اصلی کمزوری یہ تھی کہ وہ خودی کے احساس سے بالکل خالی تھے اور یہ خودی وہ چیز ہے کہ ذرا اپنے حدود سے متجاوز ہوجائے تو آدمی کو فرعون بے سامان بنا کے رکھ دیتی ہے اور اگر ذرا بھی مقدار مطلوب سے کم ہوجائے تو پھر اس کو پامال بھی کر چھوڑتی ہے۔ مولانا مرحوم نے اپنی خودی کو اس طرح فنا کر دیا تھا کہ ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی تکلف نہیں ہے کہ اگر اس طرح وہ اپنی خودی کو خدا کے لیے فنا کر دیتے تو وہ اپنے وقت کے صرف ایک بہت بڑے مصنف ہی نہیں بلکہ اپنے زمانے کے جنید و شبلی ہوتے۔

آج یہ رسالہ ریویو کے لیے اٹھایا تو مولانا کی تصویر پر نظر پڑگئی۔ اس تصویر کو دیکھ کر ایک ایسے دور زندگی کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آگیا جس سے اپنا بھی گہرا تعلق رہا ہے۔ یہ دور اب ختم

ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی کمزوریوں کو معاف کرے اور ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

اس نمبر کو مرتب کرنے والے مولانا کے ایک معتقد کبیر احمد صاحب جائسی ہیں اور اس میں شبہ نہیں ہے کہ انھوں نے اس کو بڑے سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ اس کی قیمت ۸ رہے۔ مولانا کے حالات زندگی معلوم کرنے کے لیے اس سے زیادہ مستند مجموعہ شاید ہی کوئی اور مل سکے۔ اس میں سارے ہی مضامین ان ارباب قلم کے ہیں جو مولانا مرحوم سے براہ راست واقف رہے ہیں۔ اور انھوں نے مولانا کا عیب و ہنر سب کچھ بیان کر دیا ہے۔

بقیہ تذکرہ و تبصرہ

(۴)

سفر حج کے مشاہدات و تاثرات کی آخری قسط پچھلے نمبر میں شائع ہوگئی اب بہت سے قارئین کا اصرار ہے کہ اس کی وہ ابتدائی قسطیں بھی میثاق میں شایع کی جائیں جو "المنبر" (لائل پور) میں شائع ہو چکنے کے سبب سے میثاق میں شائع نہیں کی گئی تھیں۔ ہماری ذاتی خواہش تو یہ تھی کہ اب ان صفحات کو دوسرے ضروری مباحث کے لیے بچایا جاتا لیکن رسالہ کے قارئین ایک تو ہمارا وہ وعدہ یاد دلاتے ہیں جو ہم نے اگست کے پرچے میں کیا تھا، دوسرے وہ اپنے مطالبہ کی تائید میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ میثاق کے اکثر قارئین "المنبر" میں سفرنامہ کی مذکورہ قسطیں نہیں پڑھ سکے ہیں۔ درآنحالیکہ یہ قسطیں سفر کے نہایت اہم مراحل سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ ہمارے نزدیک ان کی یہ دلیل وزنی ہے اس وجہ سے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ قسطیں بھی میثاق میں شایع کر دی جائیں۔ چنانچہ اس فیصلہ کے مطابق اس کی پہلی قسط اس شمارے میں دے دی جاتی لیکن دوسرے ضروری مضامین نے جگہ روک لی اس وجہ سے وہ نہ دی جا سکی۔ انشاء اللہ آئندہ شمارے سے یہ سلسلہ جاری کر دیا جائے گا۔

اطلاع

خط و کتابت کرتے وقت پتہ صاف اور خوشخط تحریر کریں،
اور خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ (مینجر)